دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

پاکستان تناظر

مجوزہ دستاویز نمبر 1

قیمت: 100 روپے

کانگریس 2018ء

فہرست

1۔مارکسی تناظر کی اہمیت

2۔'جمود' کی حرکیات

3۔ناکام ریاست

4۔اقتصادی بربریت

5۔قومی مسئلے کی اہمیت اور پیچیدگی

6۔سیاسی بیگانگی سے طبقاتی جنگ کی طرف سفر

1۔ مارکسی تناظر کی اہمیت

عالمی مالیاتی بحران کو دس سال ہو چکے۔ عروج و زوال کے چکر کے 'مسلمہ قانون' کے تحت معیشت کو کب سے اپنے پاؤں پر نہ صرف کھڑا ہو جانا چاہیے تھا بلکہ دوڑنا شروع کر دینا چاہئے تھا مگر صورتحال اس کے برعکس ہے اور دوڑنا تو درکنار رینگنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ سرمایہ داری کا بحران بے قابو ہو کر ایک کے بعد دوسرے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا ہے۔ 2008ء کے مالیاتی بحران کے بعد مسلسل جاری رہنے والی معاشی زبوں حالی کا حالیہ مرحلہ انتہائی تشویشناک ہے جو پہلے سے جاری بحران کا تسلسل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نئے اور پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک بحران یعنی عالمی کساد بازاری کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مرحلے میں کچھ عرصہ قبل تک مستحکم دکھائی دینے والی ریاستیں جیسا کہ کینیڈا، جرمنی اور آسٹریلیا بھی اب بحران کی حدت محسوس کر رہی ہیں۔ خاص طور پر جرمنی میں ہونے والے حالیہ انتخابات کے نتائج نے جرمن سماج میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور سیاسی قیادتوں پر مسلسل بڑھتے ہوئے عدم اعتماد کا اشارہ دے دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے یہ نتائج نہ صرف دائیں بازو کی روایتی پارٹیوں بلکہ سوشل ڈیموکریٹوں کی بھی بدترین انتخابی کارکردگی ہے اور ان کے متوازی دائیں اور بائیں دونوں طرف پولرائزیشن کا آغاز ہو چکا ہے جس کا اظہار AfD کی جزوقتی مقبولیت اور ڈی لنکے کی نسبتاً بہتر ہوتی ہوئی ساکھ میں ہو رہا ہے۔ بریگزٹ، کیٹالونیا کا ریفرنڈم اور اٹلی میں سیاسی اتھل پتھل یہ سب جہاں ایک طرف یورپ کی سیاسی تاریخ میں ایسی انہونیاں ہیں جن کا چند سال قبل تک اگر کوئی امکان تک ظاہر کرتا تو اسے پاگل خانے میں ڈال دیا جاتا، وہیں یہ سب یورپ میں ابھی ایک طویل، متلاطم اور سنسنی خیز سیاسی تبدیلیوں کی محض شروعات بھی ہے۔

امریکہ بہادر کی یوکرائن اور مشرقِ وسطیٰ میں ہونے والی تذلیل کئی عشروں کی یکسانیت زدہ سفارتکاری کے بعد بین الاقوامی تعلقات میں فیصلہ کن موڑ کی غمازی کر رہی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کا امریکی صدر بننا کوئی معمہ نہیں بلکہ گہری تاریخی ضرورت کا منطقی اظہار نہ ہو سکنے کے سبب اس کا مضحکہ خیز ردِعمل ہے۔ نام نہاد ابھرتی ہوئی معیشتوں کے غبارے سے ہوا کب کی نکل چکی اور اب برازیل،

جنوبی افریقہ، انڈیا اور حتیٰ کہ چین میں بھی ریاستی اور حکومتی سطح پر محسوس کی جانے والی تمازت کسی بڑے سیاسی آتش فشاں کے پھٹنے کی تنبیہ ہے۔ غرضیکہ گزشتہ چند برسوں میں بہت کچھ ہو چکا مگر یہ سب کچھ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں جو اگلے چند سالوں میں ہونے کی طرف جا رہا ہے۔ 2008ء سے پہلے کی دنیا کہیں دور کھو چکی۔ اب اسے شاید آثارِ قدیمہ والے ہی آئندہ نسلوں سے متعارف کرائیں۔ یہ نسل جواب جوان ہو رہی ہے اس کے لیے ماضی سے زیادہ مستقبل اہمیت کا حامل ہے۔ سرمایہ پرستوں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ اس صورتحال کا کس طرح سے راستہ روکیں۔ وہ حال سے نالاں ہیں اور مستقبل سے خوفزدہ اسی لیے ماضی کی رجعتیت میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

بحران کا سب سے المناک پہلو بھی یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی معذرت خواہ، نظریہ دان، ماہرِ معیشت، دفاعی تجزیہ کار، عظیم سفارتکار، سماجی سائنسدان ایسا نہیں جو اس بحران کی درست تشخیص کر سکے۔ اور جب تشخیص ہی نہ ہو پائے تو علاج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب عالمی امن اور سماجی دھارے کی ٹوٹ پھوٹ کو ہونق ہو کر دیکھنے اور ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ خانہ جنگیوں، دہشت گردی، بڑے پیمانے کی ہجرتوں، قدرتی آفات اور انسانی المیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ ان سب اندوہناک آفات کا مقابلہ کرنے کی نااہلیت تو اپنی جگہ، یہ سب معزز خواتین وحضرات خود خبردار بھی کر رہے ہیں کہ صورتحال اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر عالمی معیشت کی بے لگام گراوٹ کبھی نہ دیکھے گئے ہی نہیں بلکہ کبھی نہ سوچے گئے سماجی عدم استحکام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دنیا کے اہم ترین معاشی جریدے فنانشل ٹائمز نے 8 اکتوبر 2017ء کو اپنی ویب سائٹ پر وولف گینگ شیبل (Wolfgang Schauble) کا انٹرویو شائع کیا ہے جو گزشتہ آٹھ سال سے دنیا کی اہم ترین معیشتوں میں سے ایک یعنی جرمنی کا وزیرِ معاشی امور رہا ہے اور اب اپنی خدمات سے بری الذمہ ہونے کی طرف جا رہا ہے۔ انٹرویو میں موصوف نے خبردار کیا کہ ''عالمی قرضوں اور لیکویڈیٹی کے ابلتے ہوئے مرغولے عالمی معیشت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں''۔ یورپی ثقافت کی سبقت پر اترانے والے اس مہان معیشت دان کا مزید یہ کہنا تھا کہ ''مرکزی بینکوں نے منڈی کو کھربوں ڈالر کے جو ٹیکے لگائے ہیں اس سے نئے بلبلے بن چکے ہیں جن کے پھٹنے کے خطرات اب مستقل رہیں گے۔''

دی گارڈین کے معاشی مدیر لیری ایلیٹ 26 ستمبر کو لکھتے ہیں کہ ''گریٹ ڈپریشن کے بعد سے

اب تک کی سب سے بڑی معاشی مندی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر عالمی معیشت کو ایک تازہ دم بحران اور روبوٹ ٹیکنالوجی کے عہد سے نبرد آزما ہونے کی نا اہلیت کا سامنا ہے''۔ اسی طرح کی دیگر بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں عظیم پیشہ ور ماہرین ایک بہت بڑے معاشی زلزلے کی آمد پر متفق ہیں مگر سب کے سب اس کی ظاہری وجہ یعنی قرضوں کے پہاڑ کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ حالانکہ قرضوں کے پہاڑ بھی خود وجہ نہیں ہیں بلکہ مرض کے لاعلاج ہو جانے کی علامات ہیں۔ اصل میں سرمایہ داری کو اب عارضہ نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری خود عارضہ ہے جس کا علاج ظاہر ہے کہ وہ خود کرنے کی اہل نہیں۔ نامور کینشین اسٹ اور کنگسٹن یونیورسٹی لندن کے معاشیات کے ڈین سٹیو کین بھی ایک نئے مالیاتی بحران کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مگر جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس بحران سے بچا جا سکتا ہے تو ان کا جواب تھا نہیں۔ اس نظام کے وظیفہ خوار چونکہ مکمل طور پر بے بس ہو چکے ہیں اس لیے ہر طرح کی بونگیاں مار رہے ہیں۔ جیسا کہ دی گارڈین کے مذکورہ بالا مضمون میں ہی لیری ایلیٹ عالمی سرمایہ داری کے ایک اہم ادارے یعنی ورلڈ اکنامک فورم کے بانی اور ایگزیکٹو چیئرمین کلاز شیواب (Klaus Schwab) کا حوالہ دیتا ہے جس میں جناب فرماتے ہیں کہ ''آگے چل کر کسی بھی ملک کی عالمی مسابقت کی اہلیت کا تعین اس ملک کی جدت کی صلاحیت (Innovative Capacity) کی قابلیت پر ہوگا۔ آئے روز ٹیلنٹ سرمائے سے زیادہ اہمیت اختیار کرتا جائے گا۔ اس لے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا اب سرمایہ داری کے عہد سے ٹیلنٹ ازم (Talentism) کے عہد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ ممالک جو چوتھے صنعتی انقلاب کی تیاری کریں گے اور بیک وقت اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی نظاموں کو بھی مضبوط کریں گے وہی مستقبل کی دوڑ کے فاتح قرار پائیں گے۔'' یہ تحریر اس نظام کے موضوعی بحران کی درست عکاسی کرتی ہے جس میں بحران سے نکلنے کا کوئی حل پیش کرنے کی بجائے ایسی اصطلاحات میں پناہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جن کا معیشت سے قطعاً کوئی تعلق ہی نہیں۔ چوتھا صنعتی انقلاب کیسے ہوگا اور وہ معجزاتی ٹیلنٹ ہے کیا جو فتح کی لازمی شرط ہے، اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا اور نہ ہی بتایا جا سکتا ہے۔ یہ کسی معاشی تجزیئے سے زیادہ دیو مالائی کہانی لگتی ہے یا پھر کوئی رومانوی فلم جس کا نام ہونا چاہیے 'جو جیتا وہ سکندر'۔

حقیقی المیہ محض یہ بھی نہیں کہ دائیں بازو کے یہ چہیتے دانشور کچھ حل نہیں دے پا رہے، بلکہ اس کا سب سے تلخ پہلو یہ ہے کہ کارل مارکس جس نے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال قبل ہی اس بحران کا

تناظر اور حل پیش کر دیا تھا، اس کے ماننے والے یعنی خود کو مارکسسٹ کہنے والے بڑے بڑے جغادری بھی موجودہ عہد اور اس کے کردار کو سمجھنے سے مکمل طور پر قاصر ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر نے تو مارکس، اینگلز، لینن اور ٹراٹسکی وغیرہ کے نکالے گئے نتائج کو زبانی یاد کیا ہوا ہے اور اس طریقہ کار سے یہ مکمل طور پر نابلد ہیں جن کے ذریعے یہ تاریخی اہمیت کے حامل نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اور خاص طور پر تاریخ، جغرافیے اور اشتراکیت کے یہ چیمپئین خواتین وحضرات معیشت اور سب سے بڑھ کر مارکسی فلسفے کے بنیادی میتھڈ سے اتنے ہی آشنا ہیں جتنا کہ ہمارے کسان خلائی شٹل سے متعارف ہیں۔ ان میں سے پاکستان کے ایک مہان مارکسی دانشور سے کسی نے پوچھا کہ حضور آپ نے کارل مارکس کی کتاب 'داس کیپیٹل' پڑھی ہے تو سرکار نے مسکرا کر جواب دیا کہ نہیں میں نے نہیں پڑھی لیکن میں نے اس کے جوہر کو اپنی حسیات میں جذب کر لیا ہے۔ اب خدا جانے ایسا مارکسی انجکشن کون سا ہے، کہاں سے ملتا ہے اور کون لگاتا ہے جو مارکسزم کو پڑھے بغیر حسیات تک پہنچا دیتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ تیسری دنیا ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں بائیں بازو کے زیادہ تر اسکالر ایسے ہی ریڈی میڈ مارکسسٹ ہیں جو مارکس اور لینن کی کتب سے زیادہ اکانومسٹ، فنانشل ٹائمز اور دیگر بورژوا جریدے پڑھ پڑھ کر اور بوقتِ ضرورت انہی تجزیوں کو ہو بہو اپنے مضامین وغیرہ میں نقل کرتے ہوئے بوڑھے ہو گئے ہیں اور خود پر چھاپ مارکسزم کی ہی لگائی ہوئی ہے۔ اور جب یہ لوگ تجزیہ اور تناظر ہی غلط تخلیق کرتے ہیں تو یہ عالمی سیاسی بحران میں عملی کردار کیسے ادا کر پائیں گے۔ ایسے وقت میں جب مارکس کے نظریات کی درستگی بار بار خود کو منوا رہی ہے، لوگ مارکسی قیادت کے لیے سسک اور بلک رہے ہیں، یہ نام نہاد مارکسی سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کے ہاتھوں (انتہا پسندی یا اصلاح پسندی دونوں شکلوں میں) ٹشو پیپر کی طرح استعمال ہو رہے ہیں۔ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ان پر لگے مارکسزم کے لیبل کی وجہ سے یہ سوال پوچھتی ہے کہ یہ بھی اگر کوئی حل پیش نہیں کر پا رہے تو پھر انسانیت کا مستقبل کیا ہوگا۔ یوں یہ آخری تجزیئے میں مایوسی، بدظنی، گمراہی اور نظریاتی انحراف پھیلانے کا موجب بن رہے ہیں۔

مارکسزم کے درست فلسفیانہ طریقہ کار سے نابلد ہونے کے باعث یہ کسی بھی دی گئی صورتحال کی تاریخ سے کوئی نہ کوئی مثال ڈھونڈ کر اس کی 'Analogy' بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر جو اس وقت کے مارکسی اساتذہ نے کیا تھا اور کہا تھا اس کو طوطے کی طرح دہراتے چلے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سارے حوالوں سے موجودہ عہد تاریخ کا یکسر منفرد عہد ہے۔اس کی تاریخ سے کوئی بھی مثال ڈھونڈنی ناممکن ہے۔مثال کے طور پر جو مارکسی دانشور تیسری عالمی جنگ کا تناظر تخلیق کررہے ہیں،ان کا خیال یہ ہے 1929ء کی کساد بازاری نے جس طرح دوسری عالمی جنگ کو جنم دیا تھا اسی طرح حالیہ بحران بھی کسی تیسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔یہ لوگ امریکہ اور چین میں بڑھتے ہوئے تنازعات کو تو دیکھتے ہیں مگر ان کے ایک دوسرے پر انحصار کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں،اسی طرح شمالی کوریا،ایران اور روس وغیرہ کے ساتھ حالیہ امریکی تعلقات کی کشیدگی، جاپان سمیت دیگر بہت سے ممالک کے بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات، نئے اتحاد، چین اور بھارت کے مفادات کا ٹکراؤ وغیرہ وغیرہ یہ سب دلیلیں ایک میکانکی طرزِ فکر کی غمازی کرتی ہیں۔حقیقت میں نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی یہ تشویشناک کیفیت، بین الاقوامی تعلقات کے متضاد کردار اور عوامی شعور پر اس کے اثرات، ریاستوں کی خارجہ اور داخلی پالیسیوں کے آپسی گٹھ جوڑ اور دیگر ضروری عوامل کو ماضی کی مثالوں کی عینک سے زیادہ ویسا ہی دیکھنے کی ضرورت ہے جیسا کہ وہ ہیں۔ تیسری عالمی جنگ کے امکانات اگرچہ خاصے کم ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر مستقبل میں امن قائم ہوسکتا ہے بلکہ خانہ جنگیاں،نسلی،قومی، مذہبی،فرقہ وارانہ ولسانی تعصّبات کو ہوا دے کر ہی سرمایہ دار اپنے اقتدار کو طوالت دینے کی کوشش کریں گے۔لیکن سماج کی رگ وپے میں پلنے والی بغاوت کا راستہ روکنا مشکل سے ناممکن ہوتا چلا جارہا ہے۔فرانس اور جرمنی میں دائیں بازو کی رجعتی قوتوں کے وقتی ابھار سے فاشزم کا تناظر بنانے والے بھی سماج میں طبقاتی توازن کی موجودہ کیفیت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔مغربی دنیا میں کسان آبادی کا تقریباً خاتمہ اور آبادی کی بھاری اکثریت کی پرولیٹیرینائزیشن فاشزم کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔اس لیے معاشی بحران کے طوالت اختیار کر جانے کے باعث یورپ اور جدید ترقی یافتہ دنیا میں آنے والے عشرے طبقاتی جدوجہد کے ابھار کی نوید سنا رہے ہیں۔مارکسی قیادت کے فقدان کے باعث وقتی پسپائیاں بھی اس عمل کا ناگزیر حصہ ہونگی۔

ڈونلڈ ٹرمپ اور مودی کی فتح، داعش جیسی قوت کے وجود اور بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کے ضیاع سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ ایک رجعتی عہد ہے مارکسی نظریات کی تذلیل ہے۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ سے پہلے ایک مثالی معاشرہ موجود تھا،ہیلری کی فتح بلند عوامی شعور کی عکاس ہوتی،انڈیا میں کانگریس جیت جاتی تو یہ بہت بڑی انقلابی پیش رفت ہوتی۔مشرقِ وسطیٰ

میں حسنی مبارک اور دیگر بادشاہوں کے کئی عشروں پر محیط اقتدار نے ان سماجوں کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ یا اگر یہ بحران نہ ہوتا تو انسانی جانیں بہت محفوظ تھیں۔ اگر گہرائی میں جا کر دیکھیں تو اس عہد کو رجعتی قرار دینے والے شاید سوشلزم کو سرمایہ داری کی نفی نہیں بلکہ اس کی ترقی کا ہی ایک مرحلہ سمجھتے ہیں کہ پر امن اور خوشحال سرمایہ دارانہ معاشرے سے ہی بغیر کسی تشدد اور افراتفری کے سوشلزم برآمد ہو جائے گا۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک تاریخی تبدیلی کے عبوری مرحلے کی سمجھ بوجھ نہ ہونے کے باعث یہ معززین تبدیلی کے وجود سے ہی انکاری ہیں بلکہ تاریخ کی مراجعت کی بات کر رہے ہیں۔ ایک انتہائی مدبر انقلابی دانشور نے تو روزنامہ ڈان میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں موجودہ عہد کو انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ رجعتی عہد قرار دے دیا ہے۔ دراصل سالہا سال سے چلا آ رہی کیفیت مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے اور یہ مارکسی دانشور بھی اس طویل عرصے میں اسی اسٹیٹس کو کے عادی اور داعی ہو چکے ہیں۔ اور ان میں سے زیادہ تر سوویت یونین کو قبلہ و کعبہ تصور کرتے تھے اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد انہوں نے اپنا قبلہ اور کعبہ واشنگٹن میں شفٹ کر دیا تھا۔ اب چونکہ واشنگٹن ڈول رہا ہے اور اس کی چھوڑی گئی جگہ کو پُر کرنے کی صلاحیت کسی میں نہیں تو ان کے پاؤں سے بھی زمین سرک رہی ہے اور یہ چیخنا شروع ہو گئے ہیں کہ 'قیامت آ رہی ہے، قیامت آ رہی ہے۔' حقیقتاً 1960ء کی دہائی کے بعد یورپ میں پہلی دفعہ انقلابی حالات پیدا ہو رہے ہیں جو معیشت اور سیاست کی نامیاتی عالمگیریت کے باعث پسماندہ ممالک سمیت ساری دنیا کے مستقبل پر اثر انداز ہوں گے۔

یہ عہد 1960ء سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ اس وقت سوویت یونین ایک بہت بڑی سیاسی قوت کے طور پر عالمی افق پر براجمان تھا۔ وہ جہاں ہر تحریک اور انقلاب کی امیدوں کا مرکز بنتا تھا وہیں وہ ان تحریکوں کی محدودیت اور پھر شکست و ریخت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا تھا۔ ایسا انسانی تاریخ میں پہلی بار ہو رہا ہے کہ عالمی مزدور تحریک کے سامنے دیو ہیکل مسخ شدہ مزدور ریاستوں کی افسر شاہانہ زوال پذیری اور انہدام کے تجربات بھی موجود ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ذرائع پیداوار کی افزودگی سے جنم لینے والی عالمی پیمانے پر پھیلی تقسیمِ کار اور ذرائع ابلاغ کی بے پناہ ترقی کی یہ مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ اگرچہ مارکسی فلسفے کے ہاں اس کا تناظر ضرور موجود تھا مگر تناظر بنانے اور عملاً ایسی دنیا میں رہنے میں جو معیاری فرق ہے وہ موجودہ عہد کو ساری تاریخ سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے کسی بھی خطے میں ہونے والا کوئی واقعہ بہت تیزی سے دور دراز کے

براعظموں کی معیشتوں اور سیاستوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس عہد میں سماجی اور سیاسی ناہمواری اور عدم مطابقت بھی اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ایک طرف جہاں روبوٹ انسانی محنت کی جگہ لیتے جا رہے ہیں وہیں پسماندہ ترین طرزِ معاشرت بھی بہت سی جگہوں پر رائج ہے۔ سیاست کے میدان میں دیکھیں تو جہاں ایک طرف سرمایہ داری کے خلاف نفرت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہے اور سوشلزم کا نعرہ پھر بلند ہو رہا ہے تو دوسری طرف افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں انسانی تہذیب کے ہی بکھرنے کے امکانات دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسے میں مختلف واقعات کو الگ الگ اور توڑ توڑ کر سمجھنا اور پرکھنا ہی منطقی اور فطری رویہ محسوس ہوتا ہے۔کسی بھی سماج کی مخصوص کیفیت کو بیان کرنے کے لیے تو یہ طریقہ کسی حد تک کارآمد ہو سکتا ہے مگر اس سماج کے تاریخی ارتقا کی بنیاد پر مستقبل کا تناظر تخلیق کرنے کے حوالے سے یہ طریقہ سراسر غلط اور ناقابلِ عمل ہے۔اس کے لیے کسی بھی سماج کے مخصوص پہلوؤں کو عالمی معاشی، سیاسی و سماجی ارتقا کی عمومی سمت اور اس کی حرکیات کے ساتھ جدلیاتی انداز میں جوڑ کر ہی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

انسانی سماجوں کی زندگی بھی ایک انسان کی زندگی کی طرح بہت متغیر اور کثیر پہلو ہوتی ہے۔ جیسے انسان مکمل طور پر سماج کے مرہونِ منت ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے سے دوسرے انسانوں سے یکسر مختلف بھی ہوتا ہے۔ بیک وقت ایک ہی ملک، قوم، شہر، گاؤں یا محلے کے اندر بہت سے لوگ مختلف حالات اور ذہنی کیفیات میں مبتلا ہوتے ہیں۔کوئی خوش ہوتا ہے تو کوئی شدید اداس۔لیکن پھر بھی وہ تمام اسی معاشرتی کُل یعنی شہر، ملک یا دیہات وغیرہ کے اجزا ہی ہوتے ہیں اور ایک ہی سماج کی پیداوار اور اس کے باشندے ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کی بھی زندگی کو سمجھنے یا اس کے مستقبل کا اندازہ لگانے کے لیے اس سماج کے عمومی حالات اور حرکیات کا ادراک ہونا بنیادی شرط ہے۔اسی طرح آج ہم ایک عالمی معاشی، سیاسی و سماجی کُل کا حصہ ہیں۔ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ اسی عالمی کل کے مختلف اجزا ہیں اور دونوں کی موجودہ کیفیات ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہونے کے باوجود ان کی معروضی وجوہات کا تعلق ان کے کل کی نامیاتی ترکیب میں موجود بے پناہ امکانات سے ہی ہے۔اور دونوں کے مستقبل کا فیصلہ بھی اس عالمی معیشت کے عمومی کردار کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ ان میں مستقبل میں بالکل یکسانیت ہو جائے گی، اس کے برعکس یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دونوں کی موجودہ کیفیت کی بنیادی وجہ سرمایہ دارانہ نظام کا عالمگیر بحران ہے۔اس بحران نے جس سماجی بے چینی کو جنم دیا وہ ان دونوں

کے مابین وہ قدرِ مشترک ہے جو ان کو ایک عالمی معیشت کے اجزا کا درجہ دیتی ہے۔ مگر اس سماجی بے چینی کا اظہار جن شکلوں میں ہوتا ہے ان کا تعین ان سماجوں کے مخصوص ثقافتی و سماجی حالات کرتے ہیں۔ اسی لیے جہاں عالمی معیشت اور بین الاقوامی تعلقات کی گہری سمجھ بوجھ درکار ہوتی ہے وہیں اس سماج کے مخصوص عوامل (جو بعض اوقات بظاہر عمومی ڈگر سے منحرف بھی ہو سکتے ہیں) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان دونوں کو ایک تعلق میں جوڑ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سماجی بے چینی سے دونوں مختلف سماجوں میں ایک ہی نتیجہ نکالنے یعنی سوشلسٹ انقلاب کرنے کے لیے ایک ایسی غیر معمولی، منظم اور مربوط موضوعی کاوش کی ضرورت ہے جو ارتقا کے مختلف مراحل پر موجود ان سماجوں اور ان سماجوں کے اجتماعی شعور کو ایک ہی دھارے میں لے آئے۔ اسی لیے ایک مارکسی بین الاقوامی تنظیم ناگزیر ہے اور یہی اس تنظیم کا تاریخی فریضہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالمی معیشت یا سیاست کا اپنے کسی بھی ایک جزو سے یا اس کے مختلف اجزا کا آپس میں کیا تعلق بنتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عالمی معیشت ایک غیر نامیاتی یا مردہ کل نہیں بلکہ ایک نامیاتی کل ہے جو نہ صرف خود بلکہ اس کے مختلف اجزا اپنے اندر اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق میں بھی مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ایک ملک بھی عالمی معیشت کے اثرات سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن تمام معیشتیں ایک دوسرے سے بہت مختلف بھی ہیں۔ کسی بھی ایک ملک کی معیشت اور سیاست میں کچھ ایسے عناصر ضرور ہو سکتے ہیں جو براہِ راست عالمی معیشت یا سیاست سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ یوں ان اجزا میں نسبتی آزادی بھی موجود ہوتی ہے لیکن یہ عناصر بھی باقی تمام عناصر کی طرح مستقل نہیں ہوتے بلکہ متغیر ہوتے ہیں اور یہ نسبتی آزادی واپس عالمی معیشت کے قوانین کے تابع اپنی حرکت کی سمت کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کسی بھی کل کے اجزا دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کل کی ساخت اور وجود کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں جن کے بغیر کل کا وجود ہی بکھر جاتا ہے اور دوسرے وہ اجزا جو کل کے وجود کے لیے ناگزیر نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر عالمی معیشت میں کچھ ایسی معیشتیں ہیں جن کے بغیر عالمی معیشت کا تصور ہی محال ہے جن میں امریکہ، یورپی یونین، چین اور جاپان سرِ فہرست ہیں۔ اسی طرح یورپی یونین میں جرمنی، فرانس اور اٹلی کلیدی ریاستوں میں سرِ فہرست ہیں جبکہ یونان اور آئس لینڈ وغیرہ بہت چھوٹی معیشتیں ہیں جن کے باہر نکلنے سے یورپی یونین کو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن یہاں پر ایک اور سوال بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور وہ معیشت کا سیاست، سماجی و

آئینی ڈھانچے کے ساتھ تعلق کا سوال ہے۔ یونان کے بحران کے حل کے لیے جرمنی کا یونان کو بیل آؤٹ کرنا معاشی سے زیادہ سیاسی اہمیت کا حامل سوال تھا۔ اس کے بعد دیگر بہت سی معیشتیں دیوالیہ پن کے دہانے پر پہنچ رہی تھیں جن کے بیل آؤٹ کی استطاعت جرمنی میں نہیں تھی۔ اس لیے یونان کو 'سبق' سکھانا ضروری تھا جس کے نتائج آج بھی وہاں کے محنت کش بھگت رہے ہیں۔

اسی طرح پاکستان بھی سری لنکا، مالی، سوڈان اور انگولا وغیرہ کی طرح عالمی معیشت کا بہت چھوٹا جزو ہے اور ایک عالمی معیشت کا حصہ ہوتے ہوئے امریکہ، چین اور یورپی یونین سے اس کا تعلق سامراجی غلامی کے کردار کا حامل ہے۔ دوست یا اتحادی کے ناٹک میں یہ سامراجی ممالک ان چھوٹی ریاستوں کا استحصال کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عالمی معیشت کے اس کل کے اندر تیسری دنیا کی کونسی ریاست کا کس سامراجی قوت کے ساتھ یہ استحصالی تعلق استوار ہوگا اس کا تعین جغرافیائی و ثقافتی عوامل سے بڑھ کر بین الاقوامی تعلقات کے توازن اور عالمی معیشت کے اتار چڑھاؤ سے ہوگا۔ مثال کے طور پر چین اور پاکستان کے بہت دیرینہ تعلقات ہیں مگر سی پیک کی طرز کے غلیظ ترین سامراجی معاہدے کا 2008ء کے مالیاتی بحران اور عرب انقلاب کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں امریکی سامراج کی تذلیل سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان کو معیشت کے بہت ہی چھوٹے حجم کے باوجود جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے بین الاقوامی تعلقات میں ایک مخصوص مقام حاصل رہا ہے۔ سرد جنگ سے اب تک پاکستانی ریاست نے اپنے اس کردار کے بلبوتے پر مختلف سامراجی قوتوں کے ساتھ اپنے مالی و سفارتی مفادات کی بنیاد پر تعلقات استوار کرنے کی کوشش بھی کی جس نے نہ صرف پاکستان کے اندر بلکہ پورے خطے میں بحران کو اور بھی شدید کر دیا۔ یوں پاکستان میں ہونے والی سیاسی، آئینی یا سماجی تبدیلیاں سامراجی قوتوں پر بھی اہم اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ایسے میں یہ کہنا کہ عالمی واقعات کا اور بالخصوص یورپ اور امریکہ میں ہونے والی تبدیلیوں کا پاکستان پر کوئی اثر نہیں پڑتا ایک احمقانہ بات ہی ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی پاکستان میں یورپ اور امریکہ کی طرز کی معیاری سیاسی تبدیلیاں وقوع پذیر نہیں ہوئی ہیں اور نہ ہی مشرقِ وسطیٰ کی طرز کی خانہ جنگی یا بدامنی یہاں پر موجود ہے مگر ان دونوں متضاد سیاسی حالات کے بیچ پاکستان کی معروضی صورتحال کے اندر موجود ہیں۔ اور ان دونوں متضاد سیاسی حالات کے بیچ کی جو کیفیت اس وقت پاکستان میں موجود ہے اس کا لمبے عرصے تک جوں کا توں رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہ اسٹیٹس کو ظاہری، وقتی اور غیر ضروری ہے جس کی بنیادوں میں شدید دراڑیں پڑ چکی ہیں۔

عالمی معیشت اور بین الاقوامی صورتحال کو میکانکی انداز میں پاکستان پر منطبق کر دینا ایک بھیانک غلطی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ اسی طرح پاکستانی سماج کی مخصوص کیفیات کو عمومی عالمی صورتحال سے کاٹ دینا اس سے بھی بڑی غلطی ہوگی۔ اور یہ دونوں غلطیاں اگرچہ مختلف ہیں اور وقتی طور پر مختلف نتائج کو جنم دے سکتی ہیں لیکن بالآخر یہ اپنے برتنے والوں کو ایک سے دوسری انتہا کی طرف لڑھکنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر جو نام نہاد مارکسسٹ پاکستان کی مخصوص صورتحال کا رونا روتے رہتے ہیں اور اس پر مبالغہ آمیز حد تک زور دیتے ہوئے عالمی صورتحال کو نظر انداز کرتے ہیں یا قصداً اسے غیر اہم قرار دیتے ہیں وہ جلد یا بدیر لبرل خواتین وحضرات کے ساتھ ان کے کیمپ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ تیسری دنیا کے لبرلزم یا نام نہاد سیکولرازم کی فکری اساس بھی 'حالات کی مخصوصیت' کے تحت جمہوریت اور 'بنیادی انسانی حقوق' کے لیے جدوجہد پر ہی قائم ہوتی ہے۔ یہ لبرلز اسی مخصوص حالات کی آڑ میں سامراجیوں کی دلالی کو عین فطری، ضروری اور حالات سے ہم آہنگ قرار دے رہے ہوتے ہیں۔ یوں فکری اساس اور اس سے بھی بڑھ کر طرزِ فکر کی یکسانیت کے باعث یہ نام نہاد مارکسی ان لبرلز اور دائیں بازو کے قوم پرستوں کے فطری اتحادی بن جاتے ہیں۔ اور وہ سیاسی چھتری جس کے نیچے یہ سب لوگ اکٹھے ہو سکیں، ظاہر ہے کہ ایک بالشویک یا انقلابی پارٹی تو نہیں ہو سکتی، اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں سیاسی ہیئت کوئی این جی او ہی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ غور سے دیکھیں تو پاکستان میں کام کرنے والی این جی اوز میں یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے سرگرم کارکنان میں سے کون سا لبرل منحرف مارکسسٹ ہے اور کونسا بزعم خود مارکسسٹ ریڈیکل لبرل ہے۔ اور عالمی اور ملکی حالات کی مسلسل بڑھتی ہوئی پیچیدگی کے باعث زیادہ تر مارکسسٹ اس صورتحال کو سمجھنے سے قاصر ہونے کے باعث منحرف ہو کر لبرلزم میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز این جی اوز کے نام پر یہ 'سیاسی و غیر سیاسی' شغل میلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے رجحان کے پیچھے پاکستانی ریاست کے مغرب نواز دھڑے کی آشیر باد سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے۔ اس لیے آج کے عہد میں حقیقی انقلابی سیاست کے لیے تناظر کی درستگی پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اور مارکسزم ہی وہ واحد فلسفہ ہے جس کی بنیاد پر ایک سائنسی تناظر کی تخلیق کا فریضہ سر انجام دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مارکسزم کو محض حفظ نہ کیا گیا ہو۔

2۔ 'جمود' کی حرکیات

سوویت یونین کے انہدام کو تین دہائیاں ہونے کو آئی ہیں۔ یہ 27 سال بلاشبہ انسانی تاریخ کے سیاہ ترین ابواب میں سے ایک تھے۔ مسخ شدہ مزدور ریاست کے زوال کو سامراجیوں نے مارکسزم اور سوشلزم کی موت قرار دے کر دنیا بھر کے محنت کشوں کے بدترین استحصال کی بنیاد پر اپنی طبعی عمر پوری کر چکنے والے سرمایہ دارانہ نظام کو اس کی فطری حدود سے متجاوز کرنے اور اپنی لوٹ مار کو شدت بخشنے کے لئے نئی حکمتِ عملی مرتب کی۔ تاریخ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ یورپی یونین اور یوروزون کی بنیاد رکھی گئی اور آزاد منڈی کی معیشت کو بے لگام چھوڑ دیا گیا۔ دوسری طرف تقریباً سارا ہی بایاں بازو جو سوویت یونین کے انہدام کا کوئی بھی تناظر بنانے سے نہ صرف یہ کہ قاصر تھا بلکہ اس کو خارج از امکان قرار دیتا تھا، اس طبقاتی وار اور نظریاتی یلغار کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان سامراجیوں کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ پاکستان کی صورتحال بھی باقی دنیا سے مختلف نہیں تھی۔ لگ بھگ ساری ہی بائیں بازو کی تنظیمیں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو کر چھوٹے چھوٹے فرقوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ زیادہ تر ٹریڈ یونین لیڈر اور بائیں بازو کے قائدین عملاً تاریخ کے خاتمے پر تہہِ دل سے ایمان لا چکے تھے۔ ان کی اکثریت سامراجیوں کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں اور ہڈیوں سے رزق کشید کرنے کے لیے این جی اوز کی طرف راغب ہو گئی۔ اس کا نظریاتی جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ اب چونکہ سامراج اور اسٹیبلشمنٹ مسلمہ حقیقتیں ہیں اس لیے حقیقت پسندانہ روش اختیار کرتے ہوئے ان کے ساتھ ورکنگ ریلیشن شپ کے ذریعے ہی محنت کشوں کے لیے ایک آدھی چھوٹ یا رعایت کی بھیک حاصل کی جا سکتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اب چونکہ اجتماعی مفادِ عامہ یا طبقاتی نجات ممکن نہیں رہی تو اگر چند لوگوں کا اس سامراجی خیرات سے بھلا کیا جا سکتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ان چند لوگوں کے بھلے کے پسِ پردہ خالصتاً وہی ذاتی اور انفرادی ترقی اور تسکین کی قوتِ محرکہ کارفرما تھی جو سرمایہ داری کی سماجیات کا اصلی جوہر ہے۔ اس قوتِ محرکہ کی بنیاد پر یہ سابقہ بائیں بازو کے دانشور لمبی لمبی زبانیں لٹکائے، رالیں ٹپکاتے ہوئے بھوکے کتوں کی طرح سامراجی ہڈیوں پر جھپٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مہان انقلابی لکھ

پتی اور کروڑ پتی بن گئے۔ ساری ٹریڈ یونین قیادتیں بھی اسی ''حقیقت پسندی'' کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کی پے در پے غداریوں نے بھی اس سارے عمل کو مہمیز دی۔ طلبہ سیاست کا عملاً خاتمہ ہو گیا اور مارکسزم کو کلنک کا ٹیکہ بنا دیا گیا۔

ان حالات میں IMT نے نہ صرف دنیا بھر میں بلکہ پاکستان میں بھی مارکسزم کے علم کو سربلند کیے رکھا۔ یہ بالعموم مارکسی طریقہ کار اور خاص طور پر لیون ٹراٹسکی کے تخلیق کردہ عظیم مارکسی ورثے کی درست سمجھ بوجھ اور اس کے نچوڑ کا ہی تاریخی معجزہ تھا کہ ان تاریک ترین شب و روز اور ماہ و سال میں بھی IMT کی قیادت نے مارکسی نظریات کا دیپ جلائے رکھا۔ پاکستان میں بھی اس دیپ کی کرنوں کی ٹمٹماہٹ تیرگی اور ظلمت کی گہرائی اور شدت کے باعث چمکتے ہوئے چاند کی طرح سماج میں بچے کھچے اہلِ دل کی توجہ کا مرکز بننے لگی۔ لیکن معروض کے دھارے کے خلاف یہ لڑائی سیدھی لکیر میں آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔ جہاں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی مہم جوئیوں اور سیاسی محدودیت کا ایک سائنسی تناظر تخلیق کیا جا رہا تھا وہیں پاکستان کے اندر انقلابی رومانویت نے اس موضوعی خلا کو پُر کر دیا۔ جہاں ایک طرف تاریخ کے خاتمے کے نظریئے کے خلاف ایک ردِ عمل موجود تھا اور پاکستان میں بھی اس کالی رات کے خاتمے کا پرجوش تناظر تخلیق کیا جا رہا تھا وہیں سماج کے رگ و ریشے میں ہونے والی تبدیلیوں کا کوئی ٹھوس سائنسی تجزیہ اور مشاہدہ نہیں کیا گیا۔ مستقبل میں پھر ایک انقلابی تحریک پر مجنونانہ استفسار تو موجود تھا مگر بھیانک ترین حال سے وہ دلنواز مستقبل کیسے، کب اور کیوں برآمد ہوگا، اس عمل کی کوئی وضاحت یا بصیرت موجود نہیں تھی۔ یعنی معیاری جست کی پرعزم بشارتوں کے تو انبار لگا دیئے گئے مگر ان مقداری اضافوں اور اعشاریوں کے باہمی تعلق اور ارتقا کی مدلل توضیحات معدوم تھیں جن کا وہ معیاری جست منطقی اور ناگزیر نتیجہ تھا۔ مختصر یہ کہ نتیجہ تو عقیدہ بن گیا تھا مگر پراسس کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ اس لیے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے تناظرات کو سائنسی دستاویزات سے زیادہ مابعد الطبیعاتی انکشافات کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر 90ء کی دہائی کے آخری سالوں کے تناظر کی دستاویزات کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے ہی لگتا ہے کہ بس 'سوشلسٹ انقلاب کسی بھی وقت آنے والا ہے'۔ ہر تحریر میں یہی کہا جاتا رہا کہ یہ ظلم و ستم کی شدید کالی رات ہے، انسانی رشتے ناپید ہوتے جا رہے ہیں، ردِ انقلابی کیفیت شدت اختیار کرتی جا رہی ہے اور پھر ایک دم سوشلسٹ انقلاب بھی آ جائے گا۔ اس قسم کے میکانکی طریقہ کار کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جب اس کالی رات اور گہرے جمود

نے ٹوٹنا شروع کیا تو اس کے ٹوٹنے کے عمل کی کوئی سائنسی توضیح نہ ہونے کے باعث وہی لوگ جو دیوانہ وار لکھتے اور پکارتے رہے کہ سوشلسٹ انقلاب آج آیا اور کل آیا وہی یہ کہنے لگے کہ کچھ بھی نہیں بدل رہا، یہ وہی کالی رات ہے جس کی تاریکی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور جو سارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے میکانکی طرزِ فکر و عمل کے رسیاؤں کا عالمی سوشلسٹ تحریک کے دھارے (IMT) سے کٹ جانا ناگزیر تھا۔ اور یوں یہ عناصر اپنے راستے سے انہی نتائج پر پہنچے جن پر 90ء کی دہائی کے بھگوڑے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ چلو اس کو کہتے ہیں دیر آید، درست آید۔ پہنچی وہیں پر خاک جہاں کا خمیر تھا۔

اس میں رتی برابر بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک بھیانک ردِ انقلابی دور تھا۔ مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ایک قطعی (Absolute) جمود تھا جس میں سماج کی سانسیں اور نبض ہی بند ہو گئی تھی۔ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے Dark Ages کے بارے میں کچھ مورخین کے اسی قسم کے دقیانوسی خیالات رہے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں تھا اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ ایک دم عدم سے معرضِ وجود میں نہیں آ گئی تھی بلکہ وہ انہی Dark Ages کے سماجی تضادات کی کوکھ میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ پاکستان میں بھی سطح کے نیچے اور سماج کے رگ و ریشے میں غیر معمولی اہمیت کی حامل تبدیلیاں عین اسی 'جمود' کے بطن میں ہونا شروع ہوئیں جنہوں نے گزشتہ تین دہائیوں میں غیر محسوس طریقے سے پاکستان کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ سوویت یونین کے خاتمے کے وقت کے پاکستان سے آج کا پاکستان معاشی، سیاسی، ثقافتی اور عمرانی اعتبار سے معیاری طور پر مختلف ہے۔ قدیم ایشیائی طرز کے دیہی یونٹس کو تو انگریز سامراج نے بڑے پیمانے کے انفراسٹرکچر (ریلوے، سڑکیں، نہریں اور ابتدائی صنعت) وغیرہ کی تعمیر کے ذریعے توڑ پھوڑ دیا تھا مگر اس کے بعد سے اسی صنعتی انقلاب کے تعطل کے باعث ایشیائی طرزِ معاشرت کی باقیات کسی نہ کسی شکل میں برِ صغیر میں موجود رہیں۔ پاکستان میں بھی 90ء کی دہائی تک دیہی معاشرے میں ماضی بعید کے سماجی رشتوں کی چھاپ محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس کی سب سے واضح مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے زیادہ تر دیہاتوں میں 90ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں تک بھی دودھ کی خرید و فروخت (اگرچہ اس کا رسمی سا آغاز ہو چکا تھا) کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ انہی مبہم سماجی تشکیلات کے باعث بہت سے بائیں بازو کے دانشور اس فکری مغالطے میں مبتلا رہے اور آج بھی ہیں کہ یہ ایک سرمایہ دارانہ معاشرہ نہیں ہے بلکہ جاگیردارانہ

معاشرہ ہے۔ حالانکہ سامراجی اداروں اور عالمی مالیاتی سرمائے کی معیشت کے میدان میں فیصلہ کن سبقت کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ 90ء کی دہائی سے بہت پہلے ہی بڑی بڑی جاگیروں کے مالکان مالیاتی سرمائے کی غلامی کا طوق پہن چکے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ جاگیردارانہ سماجی ڈھانچے کی باقیات سے بھی چمٹے رہنا چاہتے تھے جو ایک وقت تک تو ممکن تھا مگر پھر جب اس دوغلے پن کی غیر تعقلیت ایکسپوز ہوگئی تو وہ ایک سماجی لازمے کے طور پر خود کو برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہاں البتہ سرمایہ داروں کی اپنی نامیاتی نااہلی کے باعث صنعتی انقلاب کے ذریعے جدید قومی ریاست نہ تو بنائی جاسکی ہے اور نہ ہی مستقبل میں ایسا ممکن ہے جس کے باعث جاگیردارانہ نفسیات کو فیصلہ کن اور قطعی انداز میں تاریخ کے کوڑے دان تک پہنچانا بھی پرولتاری انقلاب کے ذریعے سے ہی ممکن ہو سکے گا۔

یہ بات درست ہے کہ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا۔ لیکن زرعی شعبہ گزشتہ دو تین دہائیوں میں بہت برے طریقے سے برباد ہوا ہے۔ انگریز سامراج نے جو دنیا کا جدید ترین نہری نظام بنایا تھا وہ بھی بڑے پیمانے پر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ زرعی شعبے کی طرف حکمران طبقے کی عدم توجہی کی اصل وجہ عالمی مالیاتی سرمائے کی مداخلت کی بنا پر ملکی معاشی ڈھانچے میں مسلسل ہونے والی تیز ترین تبدیلیاں ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جاگیردار خود بینکوں سے اپنی زمینوں کے عوض بھاری قرضے لے کر زراعت کی بجائے صنعت، مالیاتی شعبے، رئیل اسٹیٹ یا سروسز سیکٹر میں سرمایہ کاری کرتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے دیگر تمام شعبوں کے مقابلے میں زرعی شعبے کا ملکی معیشت میں حصہ کم ہوتا چلا گیا ہے جس نے سماجی ساخت پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ جبکہ اس کے متوازی مالیاتی شعبہ، سروسز سیکٹر اور رئیل اسٹیٹ کے شعبے گزشتہ دو دہائیوں میں بہت تیزی سے بڑھے ہیں جن میں بڑے پیمانے کی ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاری دیکھنے میں آئی ہے۔ ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق 2016ء کے اختتام تک پاکستان کے کل GDP کا حجم 283.7 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے جو 1990ء میں کوئی 52 ارب ڈالر کے لگ بھگ تھا۔ CIA World Factbook کی ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت سروسز کے شعبے کا ملکی GDP میں حصہ سب سے زیادہ یعنی تقریباً 55 فیصد ہے۔ صنعتی سیکٹر تقریباً 20 فیصد اور زراعت کا شعبہ سکڑ کر 25 فیصد کے لگ بھگ رہ گیا ہے۔ امجد محمود 14 اگست 2017ء کے ڈان میں پاکستان کی 70 سالہ تاریخ میں زرعی شعبے کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے زرعی شعبے کے حجم کے حوالے سے اس

سے بھی زیادہ افسوسناک کیفیت کی منظر کشی کرتے ہیں۔ان کے خیال میں 50-1949ء میں زرعی شعبہ پاکستان کے کل GDP کے 53 فیصد سے بھی زیادہ تھا جواب 19.8 فیصد رہ گیا ہے اور اس میں تیز ترین گراوٹ سوویت یونین کے انہدام کے بعد کے سالوں میں دیکھنے میں آئی ہے۔معاشی ڈھانچے کی ایسی تبدیلی ناگزیر طور پر سماجی ڈھانچے کو بھی متاثر کرتی ہے۔ورلڈ بینک کی ایک اور رپورٹ کے مطابق 1990ء میں پاکستان کی کل لیبر فورس کا 51.15 فیصد زراعت کے شعبے میں برسرِ روزگار تھا۔اب تقریباً 43 فیصد اس شعبے سے وابستہ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دیہی معاشرے میں زراعت کے شعبے کے ساتھ ساتھ دیگر روزگار کے ذرائع بھی تھے۔مثال کے طور پر رپورٹ کے مطابق 1995ء میں پاکستان کی کل لیبر فورس تین کروڑ چالیس لاکھ تھی جس میں سے دو کروڑ چالیس لاکھ یعنی تقریباً 71 فیصد دیہی معیشت سے وابستہ تھے۔ان دو کروڑ چالیس لاکھ میں سے 64 فیصد براہِ راست زراعت سے منسلک تھے جبکہ 12 فیصد دیہی خدمات اور باقی ماندہ 24 فیصد کا تعلق دیہی مینوفیکچرنگ، تعمیرات اور تجارت کے شعبے سے تھا۔لیکن افراطِ زر اور دیگر معاشی اعشاریے سماجی ڈھانچے پر اس تبدیلی کے اثرات کو سمجھنے میں زیادہ معاون ثابت ہوتے ہیں۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ 90ء کی دہائی میں دیہاتوں میں مشترکہ خاندانی نظام (Combined Family System) رائج تھا۔گھر کا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو افراد کھیتی باڑی یا دیگر کام کرتے تھے اور اسی سے پورے خاندان کا گزر بسر با آسانی ہو جاتا تھا۔مگر آج صورتحال بالکل مختلف ہو چکی ہے۔زراعت کا حصہ جس تناسب سے معیشت میں کم ہوا ہے، اسی تناسب سے سرمائے کی یلغار نے دیہی معاشرے میں زندگی کی لاگت میں اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے مشترکہ خاندانی ڈھانچے کی معاشی بنیادیں ہی ختم ہو گئی ہیں اور اب زیادہ تر گھر کے افراد محنت مشقت کرتے ہیں اس کے باوجود سانسوں کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔اس لیے اسی زرعی معاشرے میں جہاں پر دودھ بیچنا تک ممنوع یا معیوب تھا اب سرمایہ دارانہ رشتے مکمل طور پر استوار ہو چکے ہیں اور نیسلے اور دیگر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا پانی گاؤں کے ہر محلے کی دکان پر فروخت کیا جا رہا ہے اور کسی کو اس پر رتی برابر بھی تعجب یا افسوس نہیں ہوتا جیسے ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا رہا ہو۔

صنعتی انقلاب نہ ہو سکنے کے باعث صنعت کا معیشت میں حصہ بہت زیادہ نہیں بڑھ پایا جس کی وجہ سے خدمات کا شعبہ پاکستان کی معیشت کا سب سے بڑا شعبہ بن چکا ہے جس کا کل GDP میں حصہ 55.6 فیصد ہے۔سروسز سیکٹر کا بڑا حصہ مالیات کے شعبے پر مشتمل ہے۔یکم نومبر

2016ء کے ڈان میں شاہد اقبال لکھتے ہیں کہ مالی سال 16-2015ء میں پاکستان کے مالیاتی سیکٹر کی شرحِ نمو 16.1 فیصد تھی۔ جبکہ اسی سال ملکی معیشت کی بحیثیت مجموعی شرحِ نمو پانچ فیصد سے بھی کم تھی۔ اسی فرق سے مالیاتی شعبے کے ملکی معیشت میں کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں یہ شعبہ بھی ابھی بہت ابتدائی مراحل میں تھا۔ گنتی کے چند ایک بینک ہوا کرتے تھے۔ پھر جب نجکاری کی پالیسی کا آغاز کیا گیا تو اس کے بعد نجی شعبے میں ہونے والی ملکی و بیرونی سرمایہ کاری کے بڑے حصے نے اس شعبے کا رخ کیا کیونکہ اس شعبے میں شرحِ منافع سب سے زیادہ ہے۔ عموماً جس شرح سے GDP میں خدمات کے شعبے کا حصہ بڑھا ہے اسی تناسب سے یہ شعبہ روزگار پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جس کی وجہ سے بحیثیتِ مجموعی بیروزگاری میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔ 1990ء میں کل لیبر فورس کا 28.92 فیصد خدمات کے شعبے سے وابستہ تھا۔ ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق 2008ء تک اس شعبے میں لیبر فورس کا 35.15 فیصد کام کر رہے تھے جو کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2011ء میں کم ہو کر 34.7 فیصد پر آ گیا۔ CIA World Fact Book کے مطابق 2015ء میں معمولی اضافے کے ساتھ لیبر فورس میں خدمات کے شعبے کا حصہ دوبارہ 35.1 فیصد پر آ گیا جو اسی عرصے میں اس شعبے میں ہونے والی سرمایہ کاری کی مناسبت سے بہت کم اضافہ ہے۔ سٹاک ایکسچینج نے بھی بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کو متوجہ کیا ہے مگر بینک تو کھمبیوں کی طرح اگ آئے ہیں۔ 30 جون 2017ء تک پاکستان میں کاروبار کرنے والے کل شیڈول بینکوں کی تعداد 34 ہو چکی تھی جن کی شاخوں کا جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ ورلڈ بینک کی ہی ایک اور رپورٹ کے مطابق 2010ء تک پاکستان میں ہر ایک لاکھ بالغ خواتین و حضرات کے لیے مختلف بینکوں کی 9 برانچیں موجود تھیں۔ یعنی تقریباً ہر دس ہزار بالغ شہریوں کے لیے کسی نہ کسی بینک کی ایک برانچ ضرور موجود تھی۔ 2010ء سے اب تک اس شعبے میں سرمایہ کاری کی شرح میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے اور بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہر چار یا پانچ ہزار بالغ شہریوں کے لیے بینک کی ایک برانچ ضرور ہو گی۔ فاٹا، بلوچستان اور پشتونخوا کے دور دراز کے قبائلی علاقوں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی دیہات ایسا بچا ہو جہاں بینک موجود نہ ہو۔ اس سے جہاں ایک طرف سرمایہ دارانہ رشتوں کی سرایت کی گہرائی کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے اور جو لوگ ابھی بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک جاگیردارانہ سماج ہے ان کی معصومیت پر ترس آنا شروع ہو جاتا ہے، وہیں سماجی نفسیات

میں اس 'جمود' کے عہد میں ہونے والی دیوہیکل تبدیلیوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ جس پانچ یا دس ہزار کی آبادی کے لیے بازار تک نہیں ہوا کرتا تھا اب وہاں پر بینک موجود ہے۔ گاؤں میں بینک بن جانے سے اور ATM کارڈ کے آئے روز بڑھتے ہوئے استعمال سے شہری نفسیات ہی گاؤں میں نہیں در آئی بلکہ اپنے ساتھ نفسا نفسی، بیگانگی اور انفرادیت کا وہ احساس بھی لے کر آئی ہے جو پرانے سماجی بندھنوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں میں معیشت کا جو شعبہ سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے وہ رئیل اسٹیٹ یعنی شہری جائیداد کا شعبہ ہے۔ تعمیرات کا شعبہ بھی اس کے ساتھ منسلک ہے۔ پاکستان شماریات کے بیورو کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان تعمیرات پر سالانہ 5.2 ارب ڈالر خرچ کرتا ہے اور تعمیرات کی آؤٹ پٹ پاکستان کے کل GDP کا دو فیصد بنتی ہے۔ شہروں میں ہی نہیں بلکہ گاؤں اور قصبوں میں بھی بڑے پیمانے پر رہائشی کالونیاں اور ٹاؤن تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ پرانا طرزِ تعمیر جو ایک مخصوص ثقافتی زندگی کا غماز ہوا کرتا تھا، ناپید ہوتا جا رہا ہے اور ڈربے نما گھر اور فلیٹس خاص طور پر شہری زندگی کا معمول بن چکے ہیں۔ اور پھر اس شعبے کا بڑا حصہ غیر رسمی معیشت کے تحت آتا ہے اور بہت سا کالا دھن بھی پراپرٹی کے شعبے کے ذریعے ہی اپنی کالک پونچھ کر سفید ہوتا رہتا ہے۔ اس سے ہی انتہائی بحران کے دنوں میں مالیاتی شعبے کو بھی تازہ دم آکسیجن ملتی رہتی ہے۔ ایک پلاٹ کی فائل درجنوں بار فروخت ہوتی ہے اور یوں قیمتوں میں مصنوعی اضافے کا ایک غبارہ بنتا ہے جو قرضوں کے غبارے میں مزید ہوا بھر دیتا ہے۔ اس جعلی معیشت نے ایک نام نہاد درمیانے طبقے کو جنم دیا ہے جس کی اخلاقیات اور نفسیات بھی ان کی معیشت کی طرح مصنوعی اور فروعی ہے۔ ان کے ہاں شادی بیاہ اور دیگر سماجی تقریبات میں سب سے زیادہ زیر بحث آنے والا موضوع پلاٹوں کی خرید و فروخت ہی ہوتا ہے۔ دیہی انفراسٹرکچر کی بربادی نے شہروں کی طرف روزگار کی تلاش میں ہجرت اور بڑے پیمانے کی اربنائزیشن کو جنم دیا ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق 1960ء میں ملک کی 78 فیصد کے لگ بھگ آبادی دیہی علاقوں میں رہتی تھی اب یہ کم ہو کر 61 فیصد تک آ گئی ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق 1950ء سے 2011ء کے درمیانی ساٹھ سالوں میں ملکی آبادی میں چار گنا اضافہ ہوا ہے جبکہ اسی عرصے میں ملک کی شہری آبادی میں لگ بھگ چھ گنا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس اربنائزیشن کا کم از کم تین چوتھائی گزشتہ تین دہائیوں میں زرعی سماجی معمول کے انتشار کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ جہاں ایک طرف شہروں کی طرف دوڑ یعنی اربنائزیشن (جنوبی ایشیا میں پاکستان

اربنائزیشن میں پہلے نمبر پر ہے) میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہو رہا ہے، اس کی مناسبت سے شہری انفراسٹرکچر اور بنیادی ضروریات اور سہولیات کی شرحِ ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پینے کے صاف پانی، بجلی، گیس، ٹرانسپورٹ اور رہائش کے مسائل نے شہروں کو بھڑکتے ہوئے دوزخ میں تبدیل کر دیا ہے۔ موسموں میں غیر متوقعہ تبدیلیوں اور امن وامان کے بڑھتے ہوئے مسائل نے سانس لینا بھی دشوار کر دیا ہے۔ آج ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً تین کروڑ بیس لاکھ یعنی 42.5 فیصد سے زائد شہری آبادی جھونپڑ پٹیوں (Slums) میں جانوروں کی طرح رہنے پر مجبور ہے۔ اس اربنائزیشن کے اثرات بھی دوطرفہ ہیں۔ ایک طرف تو شہروں میں کام کرنے والے نوجوان جب واپس دیہات میں عید تہوار وغیرہ کے سلسلے میں جاتے ہیں تو وہ شہری زندگی کے بھیانک تجربات کا کیتھارسس کرتے ہوئے اپنے مصنوعی 'بڑے پن' کا ناٹک کرتے ہیں اور شہری زندگی کا وہی رخ وہاں پیش کرتے ہیں جو میڈیا چینلز اور ٹی وی ڈراموں وغیرہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ یوں دیہات میں بھی سوچ کی کمرشلائزیشن تیزی سے بڑھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہات اور مضافات میں رئیل اسٹیٹ کی سرایت نے ایک نئی طرح کی اربنائزیشن کو جنم دیا ہے جہاں دو یا تین گاؤں کے بیچ میں ایک رہائشی پراجیکٹ کے آغاز کے ساتھ ہی مارکیٹ کا جنم ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین گاؤں معدوم ہو جاتے ہیں اور ایک قصبہ جنم لیتا ہے۔ یہ نیم اربنائزیشن روزمرہ زندگی کی ایسی کمرشلائزیشن کا سبب بنی ہے جس کا تیس سال پہلے تصور بھی محال تھا۔

سماجی نفسیات اور اجتماعی شعور میں ہونے والی ہنگامہ خیز تبدیلیوں کے حوالے سے سب سے کلیدی کردار سروسز سیکٹر میں انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ و مواصلات کے شعبے میں بے پناہ بڑھوتری کا ہے۔ 90ء کی دہائی کے اواخر میں دنیا بھر میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ابھار (Boom) دیکھنے میں آیا۔ پاکستان پر بھی اس کے اثرات پڑے اور پاکستان میں ایک نسل جس نے کبھی Landline ٹیلیفون بھی استعمال نہیں کیا تھا وہ موبائل اور کمپیوٹر کا استعمال کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی الیکٹرانک میڈیا میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کی گئی۔ 90ء کی دہائی کے شروع میں پاکستان میں صرف ایک یا دو سرکاری ٹی وی چینلز ہی موجود تھے مگر آج بیسیوں سپورٹس، انٹرٹینمنٹ، نیوز اور مذہبی ٹی وی چینلز کام کر رہے ہیں۔ مارچ 2017ء تک پاکستان میں موبائل کمپنیوں کے کسٹمرز کی تعداد 13 کروڑ 70 لاکھ ہو چکی تھی۔ جبکہ 3G اور 4G استعمال کرنے والے صارفین چار کروڑ ہو چکے تھے۔ اسی طرح 2016ء میں پاکستان میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی

تعداد تین کروڑ تینتالیس لاکھ بیالیس ہزار چار سو ہو چکی تھی۔ 2001ء میں پاکستان کے صرف 1.3 فیصد لوگ انٹرنیٹ استعمال کر رہے تھے مگر اب 18.8 فیصد لوگ انٹرنیٹ استعمال کر رہے ہیں۔ کارل مارکس نے وضاحت کی تھی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال شعور پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مگر تیسری دنیا میں جدید ٹیکنالوجی کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیون ٹراٹسکی نے مشترکہ اور ناہموار ترقی کے قانون کے تحت پیش کیا۔ اس نے جدیدیت اور پسماندگی کے ملغوبے پر مبنی جس سماج کی بات کی تھی اس کا بہترین اظہار آج پاکستان میں دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن ٹراٹسکی نے کہیں بھی یہ نہیں کہا تھا کہ پسماندہ ممالک میں ٹیکنالوجی صرف منفی اثرات ہی مرتب کرتی ہے جیسا کہ کچھ دانشور اور نام نہاد ٹراٹسکائیٹ ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں پسماندہ سماجوں پر پڑنے والے سماجی اثرات کو رومانوی انداز میں پیش کرتے ہوئے ماضی کے گاؤں، طرزِ معاشرت، کھانوں اور بندھنوں وغیرہ کو یاد کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو لے آتے ہیں اور اخلاقی گراوٹ، نفسانفسی اور بے مروتی وغیرہ کا ایسے رونا روتے ہیں جیسے کوئی ذاکر مجلسِ عزاء میں وجدانی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ حقیقت میں ٹراٹسکی کا مرکزی نکتہ اخلاقی یا رومانوی نہیں تھا بلکہ سائنسی تھا اور اس قانون کی بنیاد پر وہ پسماندہ سماجوں میں انقلابی پوٹینشل کے کم ہونے کی نہیں بلکہ بڑھنے کی وکالت کر رہا تھا۔ پاکستان میں بھی اگر ہم غور سے دیکھیں کہ جہاں ٹی وی ٹاک شوز اور ڈراموں کے ذریعے الیکٹرانک میڈیا حکمران طبقے کی اخلاقیات اور اقدار عوام کے ذہنوں میں انڈیلتا رہتا ہے اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ وغیرہ کو جنسی اور دیگر ہر طرح کی فرسٹریشن نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہیں آج دنیا بھر کی تحریکوں اور انقلابات کی خبریں بھی سوشل میڈیا کے ذریعے نوجوان نسل کی باشعور پرتوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ حکمران طبقے اور نظام پر کھلی تنقید سوشل میڈیا پر فیشن بنتی جا رہی ہے حتیٰ کہ انتہائی حساس موضوعات اور مذہبی سوالات کا بھی تنقیدی جائزہ لینا ایک معمول بنتا جا رہا ہے۔ حکمران طبقہ فرقہ واریت اور مذہبی جنونیت کو اپنے اہم اوزار کے طور پر استعمال کرتا ہے مگر جدید ٹیکنالوجی کا استعمال نئی نسل کو حکمران طبقے کے مذموم ایجنڈے کو سمجھنے کے قابل بنا رہا ہے۔ مثال کے طور پر 2005ء تک پاکستان کی ایک فیصد آبادی اپنے آپ کو لادین یا دہریا قرار دیتی تھی مگر 2012ء میں یہ تعداد بڑھ کر 2 فیصد ہو گئی۔ یعنی صرف سات سالوں میں پاکستان میں دہریوں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ اسی طرح ماضی کے ممنوعہ موضوعات کے لیے کھلنے والے نوجوان نسل کے ذہن یہ بھی بغور دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی کی آسانیوں

کے لیے تمام لوازمات دستیاب کر دیئے ہیں وہیں آج بھی آبادی کی اکثریت جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہے اور دوسری طرف ایک مٹھی بھر اقلیت کی آسائشیں اور آرائشیں دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ وہ اپنے تجربات سے اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ اس دنیا میں ایک نہیں دو دنیائیں ہیں۔ ایک امیروں کی اور دوسری غریبوں کی۔ وہ سماجی بہتر میں مخفی طبقاتی تضاد کی آنچ محسوس کر رہے ہیں۔ شعور کی ترقی اور ترویج کا یہ عمل بہت ہی پیچیدہ اور متذبذب ہونے کے باوجود مستقبل میں ایک سماجی دھماکے کے لیے لازمی مواد کو پروان چڑھا رہا ہے۔ تین عشروں کے 'جمود' کے بطن میں پرورش پانے والے تضادات اب اسی جمود کو نیست و نابود کر رہے ہیں۔ اس کے ابتدائی آثار دیکھنے کے لیے کسی خوردبین کی نہیں محض انسانی آنکھ کی ضرورت ہے۔

تاریخ بہت کفایت شعار ہوتی ہے، وہ وقت ضائع نہیں کرتی۔ پاکستان میں بھی گزشتہ تین دہائیاں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ یہ اس ملک کی تاریخ اور مستقبل کے حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسی اثنا میں پیدا ہونے والی مڈل کلاس میں انتہائی رجعتی رجحانات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ خاص طور پر ہٹ دھرمی، مسابقت اور ریاکاری گزشتہ عرصے میں بننے والی مڈل کلاس کا اہم سماجی خاصہ ہیں۔ اس کا سیاسی اظہار تحریکِ انصاف، مذہبی جنونیت یا فوج کی حمایت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر اب اس مڈل کلاس کی نچلی پرتیں بہت تیزی سے معاشی دباؤ کا شکار ہو رہی ہیں۔ اپر مڈل کلاس کی صورتحال بھی کوئی بہت اچھی نہیں۔ اسی طرح سماج کی لمپنائزڈ پرتیں بھی ہیں جو رجعتی قوتوں کے لیے خام مال کا کام کرتی ہیں لیکن مارکسی نکتہ نظر سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل سماجی پہلو یہ ہے کہ محنت کش طبقے کی ترکیب و تعداد اور معیار کی حرکت کی سمت کیا ہے اور وہ مستقبل میں کس جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہم سمجھتے ہیں کہ محنت کش طبقہ نہ صرف اس سماج کی بڑی اکثریت پر مشتمل ہے بلکہ اس کو رواں دواں رکھنے کا ضامن بھی ہے، اس حوالے سے یہ کیسے ممکن ہے کہ مذکورہ بالا سماجی تبدیلیوں سے وہ متاثر نہ ہوا ہو۔ بلکہ محنت کش طبقے کی ساخت، حجم اور شعور میں بہت اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ یہ درست ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعت کاری نہیں ہوئی ہے اور صنعتی شعبے میں کل لیبر فورس کا صرف 20 فیصد ہی کام کر رہا ہے مگر ریلوے، واپڈا، پی ٹی سی ایل، OGDCL، ٹرانسپورٹ اور پی آئی اے سمیت دیگر خدمات کے اداروں میں محنت کشوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق 2016ء میں پاکستان میں لیبر فورس کی کل تعداد 6 کروڑ اسی لاکھ چوالیس ہزار تھی۔ ڈاکٹر،

انجینئر، اساتذہ، وکلا اور صحافی یعنی تمام پروفیشنلز جو اپنے آپ کو سفید پوش یا مڈل کلاس سمجھتے تھے، مذکورہ بالا معاشی تبدیلیوں کے بعد بہت تیزی سے پرولتاریائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ وکلا اور صحافیوں میں ابھی تک اس عمل میں وہ شدت نہیں آئی ہے اور ابھی یہ ابتدائی مراحل میں ہے۔ مگر اساتذہ تو شدید معاشی دباؤ کی وجہ سے زندگی کے تلخ تجربات سے گزرتے ہوئے محنت کش طبقے کی صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ انجینئرز کی بڑی تعداد بھی بیروزگاری یا Underemployment کی اذیت میں مبتلا ہے اور ان کی نفسیات بھی بہت تیزی سے محنت کش طبقے سے مماثل ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طرح گزشتہ برس ایک احتجاجی اجتماع میں ایک ڈاکٹر نے اپنی تقریر میں پرزور طریقے سے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ ہم ڈاکٹر بھی دراصل مزدور ہی ہیں۔ یہ ایک فرد کی انفرادی رائے سے زیادہ ایک پروفیشنل کمیونٹی کا اجتماعی سماجی تجربہ ہے۔ مستقبل میں یہ عمل اور تقویت اختیار کرے گا۔ ایسے ہی جہاں ایک طرف پروفیشنلز کی پرولٹیرینائزیشن کا عمل جاری ہے تو دوسری طرف دیہی آبادی اور کسانوں کی پرولٹیرینائزیشن کا عمل بھی برق رفتاری سے جاری ہے۔ کسانوں کی بڑی تعداد گزشتہ دو تین دہائیوں میں بے ملکیتی طبقے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ان کی وافر تعداد کھیت مزدوری کرتی ہے یا تعمیرات اور خدمات کے شعبے سے منسلک ہو گئی ہے۔ بہت سے لوگ شہروں میں جا کر ہوٹلوں یا فیکٹریوں وغیرہ میں کام کرتے ہیں اور فصل کی کٹائی کے وقت واپس گاؤں کا رخ کرتے ہیں۔ گو کہ یہ عمل اس خطے کے لیے نیا نہیں لیکن اب اس کا حجم اور رفتار پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ چکی ہے اور سماج کی وسیع ترین پرتیں اس عمل کا حصہ بن رہی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کی بڑی تعداد گزشتہ عرصے میں محنت کی منڈی میں داخل ہوئی ہے۔ گارمنٹس، دوا ساز اور الیکٹرانک اسمبلنگ کی صنعتوں میں مزدوری سے لے کر ریستورانوں اور مسافر بسوں میں ویٹر جیسے بہت سے شعبوں میں خواتین کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ انہی تمام وجوہات کی بنا پر یہ معیاری طور پر ایک بلند مرحلے پر اظہار کرنے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ بیروزگاری یا جزوی روزگار وغیرہ کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ محنت کش طبقے کی تعداد میں گزشتہ عرصے میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔ مستقبل میں حالات کے جبر کے نتیجے میں یہ محنت کش نہ صرف سماجی بلکہ سیاسی کردار ادا کرنے کی طرف بڑھیں گے۔ غرضیکہ محنت کش طبقے اور غریب عوام کی نئی نسل طبقاتی معرکے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

3۔ناکام ریاست

مورخہ 17 اکتوبر 2017ء کی میڈیا رپورٹس کے مطابق پاک افغان بارڈر پر صرف 24 گھنٹوں میں تین ڈرون حملے کیے گئے جن میں 31 افراد کے ہلاک ہونے کی اطلاعات ہیں۔کہا یہ جارہا ہے کہ ان حملوں میں حقانی نیٹ ورک سے تعلق رکھنے والے اہم لوگوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ڈرون حملوں کا حالیہ سلسلہ اس لیے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ کی صدارتی کامیابی کے بعد سے پاک امریکہ تعلقات میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اتنی شدید کشیدگی دیکھنے میں آئی ہے۔امریکہ کے سیاسی افق پر آنے والی اس غیر متوقع تبدیلی نے پاکستان کے ریاستی بحران کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔خارجہ پالیسی کے معاملے میں پاکستانی ریاست واضح طور پر دو بڑے دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور ان دو دھڑوں کے اندر مزید کئی طرح کی گروہ بندیاں ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔دوسری طرف پاکستان کے ساتھ تعلقات کے معاملے میں خود امریکی ریاست کے اندر بھی دراڑیں پائی جاتی ہیں۔امریکی اسٹیبلشمنٹ کے کچھ لوگ پاکستان کے ساتھ نرم رویہ رکھنے کے خواہاں ہیں مگر ٹرمپ نے ایک سے زیادہ بار پاکستان کے لیے جو زبان استعمال کی ہے،اس سے جہاں ایک طرف افغانستان میں مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکنے کی فرسٹریشن کا اظہار ہوتا ہے وہیں پاکستان کے چین کے ساتھ معاشی وسیاسی معاشقے پر برہمی بھی اس کی اہم وجہ ہے۔

لیکن یہ صورتحال صرف امریکہ کے ساتھ تعلقات تک محدود نہیں بلکہ سعودی عرب جو ہمیشہ سے پاکستان کا اہم معاشی وسیاسی مددگار رہا ہے،اس کے ساتھ بھی پاکستانی ریاست کے تعلقات تاریخ کی بدترین سطح پر آ گئے ہیں۔جبکہ ایران کے ساتھ بھی رواں سال سرحدی تنازعات میں اضافہ ہوا ہے۔انڈیا کے ساتھ تو وقتاً فوقتاً سرحدوں پر ہونے والی جھڑپیں معمول کی بات بن چکی ہیں۔اسی طرح اس خطے کے دیگر ممالک جن میں بنگلہ دیش اور افغانستان سرِ فہرست ہیں، وہ بھی پاکستان سے کچھ زیادہ خوش دکھائی نہیں دیتے۔سارک کانفرنس کے پاکستان میں انعقاد کے وقت پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی کھل کر سامنے آ گئی تھی جب افغانستان اور بنگلہ دیش جیسے مسلم

اکثریتی ممالک نے بھی پاکستان کی میزبانی میں ہونے والے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس ساری صورتحال میں چین پر پاکستانی ریاست کا انحصار مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے جبکہ چین کا اپنا معاشی وسیاسی تناظر بہت زیادہ خوش آئند نہیں۔ مختصر یہ کہ خارجہ محاذ پر پاکستان ایک بند گلی کی طرف برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔

ریاستِ پاکستان کی تخلیق کوئی انقلابی پیش رفت نہیں تھی بلکہ برطانوی سامراج کی 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی تاریخی پالیسی کا نتیجہ تھی۔ یعنی ریاست پاکستان برطانوی سامراج کے جرائم میں سے ایک بہت بڑا جرم ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں طاقتوں کے توازن میں بڑے پیمانے کی تبدیلی رونما ہوئی تھی اور امریکہ اور سوویت یونین دو بڑی سپر پاورز بن کر ابھرے تھے۔ برِصغیر کی تقسیم کے بعد باقی ماندہ ہندوستان کا حکمران طبقہ سوویت بلاک کی طرف مائل ہوا جبکہ مملکتِ خداداد کے حکمران طبقات کا رجحان اپنی پیدائش کے ردِ انقلابی کردار کے باعث روزِ اول سے ہی امریکہ بہادر کی طرف تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی تکنیکی نااہلی اور تاریخی تاخیر زدگی کے باعث اس حکمران طبقے کا امریکہ بہادر پر انحصار کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسی دوران امریکی آشیر باد سے چینی بیوروکریسی کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات استوار ہوئے، اور اسی طرح 69-68ء کے انقلاب کی دیوہیکل عوامی طاقت کے سیاسی افق پر اظہار (ناکامی کے باوجود) کے باعث امریکہ بہادر سے ہونے والی وقتی چپقلشوں نے اس وقت کے اصلاح پسندوں کو کسی حد تک سوویت بیوروکریسی کے ساتھ علیک سلیک شروع کرنے کی طرف راغب کیا۔ مگر جلد ہی ریاستی اور سامراجی خداؤں نے اس کا انتقام ضیاء الباطل کی شکل میں لیا۔

اس کے بعد مملکتِ خداداد نے سوویت یونین کے خلاف امریکی سرد جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی کا کردار نبھایا۔ اسی غلیظ کردار کے باعث منشیات، اسلحہ، لسانی تعصّبات اور بنیاد پرستی جیسے ناسور ریاستی اداروں کی آشیر باد میں مملکتِ خداداد میں پلنا بڑھنا شروع ہوئے۔ امریکی سامراج کی طرف سے ان تمام سماجی اژدھوں کی مالیاتی کمک ہمیشہ بڑھائی جاتی رہی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے سرمایہ دارانہ عروج کے دور میں اتنی زیادہ قدرِ زائد نچوڑی گئی تھی کہ سامراجی آقا سرد جنگ کی کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار تھے۔ مگر ساتھ ساتھ مملکتِ خداداد کی ایک متوازی معیشت تعمیر کی گئی جس کا کام صریحاً کفار یعنی سوویت یونین کے خلاف جہاد کے مالیاتی اخراجات برداشت کرنا تھا۔ یہ سارا خونی کھلواڑ مذہب کے نام پر رچایا گیا اور ثور انقلاب کے بعد افغانستان

میں سوویت یونین کی مداخلت کو ناکام کرنے کے لیے ایک جال بُنا گیا جس میں زوال پذیر سوویت بیوروکریسی اوندھے منہ آ پھنسی۔ یوں امریکی سامراج کی وفاداری میں بے پناہ ڈالروں کے عوض پاکستانی ریاست نے افغانستان میں بھی بربریت کے بیج بوئے۔

بورژوا مورخین کے مطابق سوویت یونین کا انہدام امریکی سرد جنگ کی درست حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ اس مفروضے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگرچہ افغان جنگ نے کسی حد تک اس عمل کو مہمیز دی مگر سوویت یونین کے انہدام کی تمام تر ذمہ داری سوویت بیوروکریسی کی مجرمانہ پالیسیوں پر عائد ہوتی ہے۔ سوویت یونین کو تو اپنے منطقی انجام کو پہنچنا ہی تھا مگر عملاً دیکھا جائے تو امریکہ بہادر نے سرد جنگ کے ذریعے صرف افغانستان کو ہی برباد نہیں کیا بلکہ مستقبل میں اپنے لیے بھی ایک نا قابلِ گریز دلدل خود تخلیق کی اور آج وہ گھٹنوں تک اس میں دھنسا ہوا نظر آ رہا ہے۔ افغانستان امریکہ کے لیے ایک نا قابلِ حل پہیلی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ وہ یہاں رہ بھی نہیں سکتے اور یہاں سے جا بھی نہیں سکتے۔ رواں سال پھر انہیں 4000 کے قریب فوجی ایک دفعہ پھر افغانستان میں تعینات کرنا پڑے ہیں۔ اسی 'معرکتہ الآرا' سرد جنگ میں امریکہ نے اپنی بغل بچہ ریاست پاکستان میں جو متوازی معیشت تعمیر کی تھی وہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نہ صرف یہ کہ کم ہونے کی بجائے مسلسل پھیلتی رہی بلکہ اس نے اپنے دائرہ اثر کو بڑھاتے ہوئے بنیاد پرستی کو ایک عارضی ہتھیار سے بڑھا کر ایک مستقل سیاسی مظہر کے طور پر پاکستان کے اہم ریاستی اثاثے میں بدل دیا۔

پاکستان کا حکمران طبقہ جس کے پہلے ہی اس خطے میں بالعموم اور افغانستان اور کشمیر میں بالخصوص سامراجی عزائم کارفرما تھے، نے اس پالیسی کو 'سٹریٹیجک ڈیپتھ' کے نام سے تعبیر کیا۔ دراصل امریکہ کا افغانستان سے انخلا پاکستان کے فوری مفاد کے منافی تھا کیونکہ پاکستان اپنی بغل بچہ طالبان حکومت کو بھی امریکی فوجی و مالیاتی امداد کے بغیر قائم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور پاکستان کے روایتی دشمن انڈیا اور ساتھ ہی ایران کی افغانستان میں مداخلت کے وسیع تر امکان موجود تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ انڈیا ایران یا دیگر علاقائی طاقتوں کے تعاون سے پاکستان نواز طالبان حکومت کا تختہ الٹ دیتا۔ پاکستانی ریاست کے پالیسی ساز نالاں تھے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد پیدا ہونے والی دلدل میں امریکہ پاکستان کو علاقائی طاقتوں کے توازن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان سے منہ موڑ لینا چاہتا تھا۔ لیکن اسی بنیاد پرستی، جسے خود امریکی سی آئی اے نے پاکستانی آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر تخلیق کیا تھا، کا جواز گھڑتے ہوئے امریکی سامراج خطے میں

اپنے پنجے گاڑنے کے لیے نائن الیون کے بعد افغانستان پر چڑھ دوڑا۔ پاکستانی ریاست نے ایک طرف طالبان کی سرپرستی جاری رکھی اور دوسری طرف طالبان کی طرف سے کی جانے والی کاروائیوں کے (یعنی خود اپنے) خلاف امریکی سامراج کو 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے لیے اربوں ڈالر کے فنڈز کے اجرا پر مجبور کر دیا گیا۔ یوں مشرف دور میں پاکستان میں بڑے پیمانے پر بیرونی سرمایہ کاری بھی دیکھنے میں آئی۔ مگر اس دوغلی پالیسی کے نتیجے میں افغانستان سے بھاگ کر آنے والے اسلامی جنونیوں کو پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں دینا بھی آئی ایس آئی کی مجبوری بنتا چلا گیا۔ ریاست کے کچھ سنجیدہ لوگ اس پالیسی کے مستقبل میں تباہ کن اثرات کے پیشِ نظر اس پر تنقید تو کر رہے تھے مگر اس سے ہٹ کر امریکی ڈالروں اور منشیات کی تجارت کے مال کے حصوں کے اوپر MI اور ISI سمیت ریاست کے مختلف دھڑوں کے مابین لڑائی بے قابو ہو کر پاکستانی سماج میں خودکش دھماکوں اور دیگر دہشت گردی کی کاروائیوں کے ذریعے مشرف دور میں ہی اپنا اظہار کرنا شروع ہو گئی تھی۔ خفیہ اداروں کے دفاتر پر حملے، لال مسجد آپریشن وغیرہ سب اسی داخلی کشمکش کا تسلسل ہی تھا۔ مشرف کے بعد نام نہاد جمہوری دور میں بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا لیکن امریکہ سے ملنے والی فوجی و مالی امداد نے کسی حد تک ریاست کو سہارا دیئے رکھا۔ لیکن مکافاتِ عمل دیکھیے کہ پاکستانی ریاست نے انڈیا اور ایران کی افغانستان میں مداخلت کو کسی بھی قیمت پر روکنے کے لیے جو ڈبل گیم امریکہ کے ساتھ شروع کی تھی اس کا انت نہ صرف پاکستان کے اندر تباہی و بربادی کا باعث بن رہا ہے بلکہ افغانستان میں بھی آج انڈیا اور ایران کا اثر و رسوخ پہلے کی نسبت کہیں بڑے پیمانے پر موجود ہے۔

2008ء کے مالیاتی بحران نے بین الاقوامی تعلقات کے نئے توازن کی راہیں ہموار کیں۔ امریکی سامراج اگرچہ آج بھی دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت ہے مگر اس کی سامراجی حدود دن بدن سکڑتی جا رہی ہیں۔ اس کمزوری کی بنیادی وجہ امریکی معیشت کی اپنی حقیقی استعداد سے تجاوز کردہ مصنوعی پھیلاؤ سے نمٹنے کی ناکامی ہے۔ اسی وجہ سے گزشتہ دہائی میں امریکی تھنک ٹینکس پاکستانی ریاست کی دوغلی پالیسی کے مالیاتی نتائج پر انگلی اٹھانا شروع ہو گئے تھے جس کا اظہار گزشتہ کئی سالوں سے امریکیوں کی طرف سے 'ڈو مور' کے مطالبے کی شکل میں سامنے آ رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف پاکستانی ریاست کے مختلف دھڑوں اور ان کے پروردہ مذہبی جنونیوں میں لوٹ کی ہوس کئی گنا بڑھ چکی تھی اور وہ امریکی آقاؤں سے اپنی خدمات کے بدلے اور زیادہ معاوضے کا

مطالبہ کرتے رہے۔ جوں جوں امریکہ سے آنے والے مال میں کمی آتی رہی پاکستانی ریاست کے مختلف اداروں کے مابین ہونے والی لڑائی ان اداروں کے اندر تک سرایت کرتی چلی گئی۔ اب اگرچہ مختلف سکیورٹی ادارے آپس میں بھی دست و گریبان ہیں مگر زیادہ ہولناک لڑائی اب ان اداروں کے اندر چل رہی ہے۔ حال ہی میں آئی بی کے ایک انسپکٹر نے عدالت میں اپنے اعلیٰ افسران کے خلاف بڑے اہم انکشافات کیے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کئی بار اس نے خود افسرانِ بالا کو دہشت گردی کی کاروائیوں سے قبل ان کی اطلاع دی تھی مگر انہوں نے ان ممکنہ واقعات کو روکنے کے لیے ادارے کو متحرک نہیں کیا، دوسرے معنوں میں وہ خود دہشت گردوں کے شریکِ کار ہیں۔ مختصر یہ کہ ریاست کے زیادہ مضبوط اور بنیاد پرستوں کے سرغنہ دھڑے کے امریکہ سے تعلقات دن بدن بگڑتے چلے گئے اور اپنی لوٹ کی ہوس کی تسکین کے لیے نئے سامراجی آقاؤں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ اسی اثنا میں یوکرائن، شام اور لیبیا میں امریکی سامراج کی کمزوری کھل کر سامنے آئی ہے۔ امریکی سامراج کی اسی کمزور صورتحال نے دنیا کے مختلف خطوں میں علاقائی سامراجی قوتوں کے کردار کو مبالغہ آرائی کی حد تک بڑھا دیا ہے۔

جنوبی ایشیا میں چین ایک ابھرتی ہوئی قوت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ایسے میں چین کو خود عالمی معاشی بحران کے اثرات سے کسی حد تک محفوظ رہنے کے لیے اپنی مصنوعات کو کم سے کم لاگت پر وسطی ایشیا کے ذریعے مغربی منڈی تک پہنچانے کے لیے پاکستانی ریاست کی خدمات کی ضرورت درپیش ہے۔ یوں سی پیک دوطرفہ باہمی ضرورت کا عملی اظہار بن کر سامنے آیا ہے۔ ون بیلٹ ون روڈ کا منصوبہ ابھرتے ہوئے چینی سامراج کی مالیاتی و سٹریٹیجک بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور سی پیک اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یوں امریکہ بہادر چینی سامراج اور پاکستانی ریاست کے اس معاشی معاشقے پر پہلے سے بہت زیادہ نالاں ہوتا جا رہا ہے۔ اوباما ایڈمنسٹریشن کی جانب سے روا رکھا جانے والا قدرے نرم رویہ ٹرمپ سرکار کے آنے کے بعد اپنی الٹ میں بدل چکا ہے۔ رواں سال پاک افغان بارڈر پر 'مدر آف آل بمبز' گرا کر امریکی سرکار نے پاکستانی ریاست اور اس کے نئے سامراجی آقاؤں کو واضح پیغام دیا تھا کہ وہ اس خطے میں محض خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تب سے اب تک صورتحال آئے روز تشویشناک ہوتی جا رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں حقانی نیٹ ورک کی تحویل سے ایک امریکی شہری اور اس کے کینیڈین شریکِ حیات کو بازیاب کروا کر امریکہ کے حوالے کیا گیا

ہے۔ یہ کوئی روٹین کی کاروائی نہیں تھی بلکہ نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی افواج کے سربراہ نے اس جوڑے کی بازیابی کے لیے پاکستان کے اندر فوجی کاروائی کی دھمکی دے دی تھی۔ اس انتہائی اقدام کو روکنے کے لیے پاکستانی سکیورٹی اداروں کو فوری طور پر متحرک ہونا پڑا۔ ابھی حال ہی میں امریکہ نے انڈیا کے ساتھ ایک سو سالہ شراکت داری کا معاہدہ کیا ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ جنوبی ایشیا میں اور بالخصوص افغانستان میں انڈیا ہی وہ واحد ریاست ہے جو قائدانہ کردار ادا کرنے کا اہل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پاکستان اور چین دونوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اس کا جواب یہ دونوں افغانستان میں اپنے پالتو دہشت گردوں کے ذریعے دیں گے جیسا کہ 19 اکتوبر کو افغان فوجیوں کے ایک قافلے پر حملہ کیا گیا جس میں 43 فوجی ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے۔ یہ سلسلہ بڑھتا رہے گا اور جواباً امریکی ڈرون حملے بھی بڑھیں گے۔ اسی طرح مشرقی سرحد پر انڈیا کے ساتھ سرحدی تنازعات میں فوری طور پر پھر شدت آئی ہے اور 27 اکتوبر کو پاکستانی فوج نے کشمیر کی سرحد پر ایک بھارتی جاسوسی ڈرون گرانے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان پہلے ہی امریکہ کی طرف سے انڈیا کو لڑاکا ڈرون طیاروں کی ممکنہ فراہمی پر شدید ردِعمل کا اظہار کر چکا ہے۔ یوں آئندہ سال خطے میں متشدد کاروائیوں میں مزید اضافہ متوقع ہے۔

بہت سے دانشوروں کے خیال میں پاکستان اب مکمل طور پر امریکہ کے سامراجی چنگل سے نکل کر چین کی نو آبادی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ معاملہ اتنا سادہ ہرگز نہیں۔ پاکستان ایک ایسی گماشتہ ریاست ہے جس کے اپنے سامراجی مفادات بھی ہیں اور اس ریاست کے منہ کو جتنا خون لگ چکا ہے اس سے زیادہ براہِ راست ڈالر یا کمیشنز کی بھوک ہے جو بے لگام ہوتی جا رہی ہے۔ افغانستان کی پوست کی کالی کمائی پر دسترس خطرے میں ہونے کی وجہ سے وہ نئے سامراجی آقاؤں سے بہت زیادہ کی توقع لگائے بیٹھے ہیں جبکہ چین ان کی توقعات پر پورا اترنے کا مجاز دکھائی نہیں دیتا۔ لیون ٹراٹسکی نے ابھرتے ہوئے امریکی سامراج کے بارے میں کہا تھا کہ یہ وہ دیو ہے جس کے پاؤں ریت کے بنے ہوئے ہیں۔ اگر ٹراٹسکی کی اس بات کو ابھرتے ہوئے چینی سامراج پر منطبق کیا جائے تو شاید ہمیں یہ کہنا پڑے کہ اس کے پاؤں ہیں ہی نہیں۔ چینی ریاست کا قرضہ چین کے کل GDP کے 300 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ چین پاکستانی ریاست کے کمیشن خوروں کی انتہاؤں کو پہنچی ہوئی ہوس پوری کرنے کا اہل نہیں بلکہ اس کے بالکل الٹ وہ تیز ترین استحصال کے ذریعے اپنے بحران سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی فوجی و مالی امداد نہیں دے

سکتا۔ یوں سی پیک میں ہونے والے معاہدوں کے کمیشنز کے اثرات بھی ان کمیشنز کی طرح لاامتناعی اور دیرپا نہیں ہوسکتے۔

دوسری طرف اس ریاست نے اپنے جنم سے اب تک صرف امریکہ ہی کی گماشتگی نہیں کی بلکہ رجعتی سعودی سامراج کے دم چھلے کا کردار بھی ادا کیا۔ اگرچہ گزشتہ عرصے میں ایران کی مداخلت بھی بڑے پیمانے پر بڑھی ہے مگر آج بھی ریاست کے غالب رجعتی دھڑے کے سعودی آقاؤں سے بڑے گہرے مراسم ہیں۔ سول سوسائٹی کے ہر دلعزیز سپہ سالار راحیل شریف کا سعودی سرپرستی میں بننے والے 37 رکنی فوجی اتحاد کا سرخیل بننا بھی اس کا واضح ثبوت ہے۔ اگرچہ مشرقِ وسطیٰ کی مسلسل بدلتی ہوئی صورتحال میں اس طرح کا کوئی بھی اتحاد مؤثر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے راحیل شریف کی واپسی کی خبریں بھی گردش کرتی رہتی ہیں۔ سعودی عرب خود عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں ریکارڈ گراوٹ کی وجہ سے اپنی تاریخ کے بدترین مالی بحران میں گھرا ہوا ہے البتہ ریاست کی طرف سے سعودیوں کی کاسہ لیسی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی ہوسکتی ہے۔ ٹرمپ سرکار کے محمد بن سلمان سے پکے یارانے استوار ہو چکے ہیں۔ یوں سعودی عرب خود امریکہ اور پاکستان کے مابین ایک اہم لنک ہے جس کے ذریعے امریکہ نہ صرف پاکستانی ریاست کے غالب دھڑے کو براہِ راست اپنی اطاعت پر واپس مجبور کرسکتا ہے بلکہ ساتھ ہی اس ریاستی دھڑے کی پروردہ مذہبی قوتوں کے ذریعے ریاست پر دباؤ بڑھایا جاسکتا ہے۔ جبکہ ریاست کا نام نہاد لبرل اور سیکولر دھڑا اور اس کے پالتو سیاستدان اور دانشور تو پہلے ہی اس کے وظیفہ خوار اور نمک حلال ہیں۔ انہی تمام عوامل کی بنا پر امریکہ پاکستانی ریاست کے پروردگاروں کے لیے انتہائی ہتک آمیز زبان استعمال کر رہا ہے۔ جیسا کہ ابھی جنوبی ایشیا کے دورے سے واپسی پر امریکی سیکرٹری خارجہ ٹیلرسن نے میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے واضح طور پر کہا ہے کہ 'پاکستان تعاون کرے یا نہ کرے دونوں صورتوں میں دہشت گردی کا خاتمہ کریں گے'۔ یوں خود سامراجی عزائم رکھنے والی یہ گماشتہ ریاست امریکی اور چینی سامراجوں کے مفادات کے ٹکراؤ میں خود اندر سے شدید ترین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور انتہائی حساس توازن پر کھڑی ہے جس کا کسی بھی داخلی یا خارجی مہم جوئی کی صورت میں دھڑام ہوسکتا ہے۔

فوج، عدلیہ اور پارلیمان

3 اکتوبر کو جی ایچ کیو میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل قمر جاوید باجوہ نے کور کمانڈرز کے ایک غیر معمولی اجلاس کی صدارت کی۔ اجلاس سات گھنٹے تک جاری رہا لیکن ISPR کی طرف سے اس اجلاس کی کاروائی یا اس اجلاس میں ہونے والے فیصلوں کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی پریس ریلیز جاری نہیں کی گئی۔ عام طور پر ISPR اس قسم کے اجلاسوں کے فیصلوں سے میڈیا کو باخبر رکھتا ہے۔ مگر اس اجلاس کی کاروائی کو مخفی رکھنے کی وجہ سے کئی قسم کی قیاس آرائیوں اور خدشات نے جنم لیا۔ اگر میٹنگ کسی قومی سلامتی کے مسئلے پر خوشگوار انداز میں ہوئی ہوتی اور زیرِ بحث امور پر اتفاقِ رائے پایا جاتا تو یقیناً اس کی پریس بریفنگ میں کسی قسم کی ممانعت کا جواز ہی پیدا نہیں ہونا تھا۔ اگلے روز ایک صحافی کے اس حوالے سے پوچھے گئے سوال پر ISPR کے ڈائریکٹر جنرل آصف غفور کے پراسرار جواب نے قیاس آرائیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ موصوف کا کہنا تھا کہ 'کچھ پیغام خاموش رہ کر بھی دیئے جاتے ہیں'۔ حالانکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اجلاس میں سات گھنٹے محض خاموشی سے کام نہیں چلایا گیا ہوگا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید باجوہ صاحب نے اپنے کمانڈروں کو افغانستان کے اپنے حالیہ دورے میں ہونے والی پیشرفت پر اعتماد میں لینے کی کوشش کی ہوگی۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ شاید انڈیا کی طرف سے مسلسل مبینہ طور پر کی جانیوالی سرحدی خلاف ورزیوں کا معاملہ زیرِ بحث آیا ہوگا لیکن زیادہ تر تجزیہ نگاروں کے خیال میں سابق وزیرِ اعظم نواز شریف کے عدالتی مقدمات کے اوپر فوج کی طرف سے اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے یہ ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا تھا۔ لیکن ایک بات پر تقریباً سارے ہی سنجیدہ حلقے متفق دکھائی دیتے تھے کہ معاملہ جو بھی زیرِ بحث رہا ہو لیکن شرکا میں اتفاقِ رائے نہیں ہو سکا۔ حتیٰ کہ عام شہریوں، طالبِ علموں اور شہری گھریلو خواتین تک کسی کی بھی رائے لے لی جائے سب کا ملا جلا تاثر یہی ہوگا کہ 'دال میں کچھ کالا ضرور ہے'۔

کسی بھی بورژوا ریاست میں فوج کے ادارے میں اس قسم کی کیفیت کا پایا جانا انتہائی تشویشناک گردانا جاتا ہے اور خاص طور پر پاکستانی ریاست جس میں فوج ہی ایک واحد منظم اور مربوط ڈھانچوں والا ادارہ ہو، وہاں اس ادارے کی ایسی کیفیت ریاست کے مستقبل کے سامنے بہت بڑا سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ ملک کے اندر اور باہر ہر طرف سے فوج کو اس وقت شدید دباؤ اور تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ابھی تین چار سال قبل تک میڈیا پر کوئی بھی کھلے عام پاک فوج کے

بارے میں طنزیہ یا تنقیدی گفتگو کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ میڈیا کے ٹاک شوز جن میں سٹیج کے نامور فنکار سیاستدانوں پر ہر قسم کے ذاتی حملے کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور حکومت اور اپوزیشن کسی کو بھی اس معاملے میں استثنا حاصل نہیں تھا، وہ بھی پاک فوج یا خفیہ اداروں کے حاضر سروس یا ریٹائرڈ سربراہان کی شان میں کوئی ایک بھی جملہ معترضہ ادا کرنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ ہزاروں بلوچ سیاسی کارکنان کو لاپتہ کر دیا گیا مگر مجال ہو جو کسی کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔ مگر گزشتہ چند ماہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت، اپوزیشن یا بہت سے صحافی حضرات بھی کھلم کھلا افواجِ پاکستان کے کردار پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ اب سندھ اور پنجاب یا بلوچستان کے سیاسی کارکنوں کو بھی جیسے ہی لاپتہ کیا جاتا ہے تو سول سوسائٹی یا میڈیا سرگرم ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر سوشل میڈیا پر بہت بڑی کمپین نظر آتی ہے۔ صورتحال یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب بلوچ کارکنوں کی بھی زندہ بازیابی کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ افواج اور سکیورٹی اداروں پر مسلسل بڑھتے ہوئے دباؤ کی غمازی ہے اور یہ بالکل نئی اور تبدیل شدہ صورتحال مملکتِ خداداد کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔

پاکستانی ریاست کے لیے اس وقت ایک بڑا مسئلہ خود ان کی پالتو اسلامی بنیاد پرست تنظیمیں ہیں۔ مدارس اور معسکروں میں ایک بہت بڑی تعداد ان پالتو جنونیوں کی موجود ہے جن کے روزگار کو ختم کرنے کے لیے امریکہ ریاست پر دباؤ بڑھا رہا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ اور بنیاد پرست کوئی ازلی اور ابدی دشمن نہیں ہیں بلکہ امریکہ آج بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہے جس کا عملی ثبوت ہم حال ہی میں مشرقِ وسطیٰ میں دیکھ سکتے ہیں۔ پاکستان اور افغانستان میں بھی وہ بارہا معتدل عناصر یا اچھے اور برے طالبان کی تمیز کرتے رہے ہیں۔ پاکستانی ریاست پر بڑھائے جانے والے اس دباؤ میں بھی ان کا خاص اسرار ان بنیاد پرست دھڑوں کی طرف ہے جن کو یا تو پاکستان افغانستان میں امریکہ نواز حکومت کو سبوتاژ کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اور جن کو امریکہ خود سعودی عرب کے ذریعے بھی کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان میں حقانی نیٹ ورک سرِ فہرست ہے۔ یا پھر وہ عناصر جن کو پاکستانی ریاست بھارتی مقبوضہ کشمیر یا خود بھارت کے اندر کاروائیوں کے لیے استعمال کرتی رہی ہے جن میں جماعت الدعوۃ سرِ فہرست ہے۔ امریکہ حافظ سعید کو دہشت گرد قرار دے چکا ہے اور بیسیوں بار اس کی گرفتاری کا مطالبہ بھی کر چکا ہے جس کے دباؤ میں کئی بار ان

جنونیوں کی نظر بندیوں کا ناٹک بھی کرنا پڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب یہ بنیاد پرست بیروزگاری کے خطرے سے دوچار ہو کر فوج پر دباؤ بڑھا رہے ہیں کہ وہ انہیں انسٹیٹیوشنلائز کرے۔

دراصل امریکہ پاکستانی ریاست کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ کشمیر پر اپنے مؤقف سے دستبردار ہو اور انڈیا کے ساتھ برادرانہ (دراصل مؤدبانہ) تعلقات استوار کرے۔ ماضی میں یہی سامراجی قوتیں ہی ان دونوں ریاستوں میں تناؤ پیدا کرنے کی ذمہ دار رہی ہیں مگر اب عالمی صورتحال میں تبدیلی، امریکی سامراج کی کمزوری اور چین کے بڑھتے ہوئے غلبے کی وجہ سے امریکہ کے پاس بھارت کے علاوہ اور کوئی آپشن نہیں اور ساتھ ہی وہ افغانستان میں پاکستان کے 'مؤثر' کردار کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ افواجِ پاکستان میں امریکہ کے اس رویے کی طرف رسپانس کے معاملے میں واضح سپلٹ بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ سب سے زیادہ رجعتی دھڑا امریکہ اور بھارت کو مطلوب حافظ سعید کی پارٹی کو عوامی سیاست کے دھارے میں لا کر اور NA120 سے انتخابات لڑوا کر (اگرچہ پارٹی ٹکٹ پر نہیں) واضح پیغام دے چکا ہے کہ وہ امریکہ اور بالخصوص انڈیا کے آگے سرینڈر کرنے کو قطعاً تیار نہیں ہے۔ ڈی جی ISPR نے واضح طور پر 4 اکتوبر والی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ انتخابات میں حصہ لینا جماعت الدعوۃ کا جمہوری حق ہے جبکہ زمینی حقائق کو تسلیم کرنے والے 'حقیقت پسند' شاید عددی طور پر کم ہیں مگر موجود ضرور ہیں۔ حافظ سعید کی نظر بندی سے رہائی کی کاروائی بھی اسی عمل کا تسلسل ہے۔

اس مبینہ 'حقیقت پسندی' کی بنیاد بھی دراصل مالیاتی اور معاشی ہے۔ پاکستانی فوج پچاس سے زیادہ کمرشل ادارے چلا رہی ہے جن کی مالیت ایک اندازے کے مطابق بیس ارب ڈالر سے زائد ہے۔ معیشت کے تقریباً ہر شعبے میں ان کی سرمایہ کاری مسلسل بڑھ رہی ہے۔ خاص طور پر جائیداد اور انفراسٹرکچر کے شعبوں میں کل سرمایہ کاری کا بڑا حصہ خود افواج کا ہے۔ یوں پاک فوج کے معیشت کے حوالے سے بھی شدید تحفظات بڑھ رہے ہیں۔ جہاں ایک دھڑے کے تمام تر مفادات دہشت گردی کی صنعت اور اس کے گرد موجود کالی معیشت سے جڑے ہوئے ہیں وہیں کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمسایہ ممالک سے اچھے تعلقات ہوں یا نسبتاً پرامن ملکی آب و ہوا ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ بیرونی سرمایہ کاری ہو اور ان کے اپنے کاروبار بھی پھلتے پھولتے رہیں۔ فوج کی موجودہ قیادت بھی اپنے پیشروؤں کی طرح دونوں دھڑوں کو ساتھ ملا کر ادارے کو چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ گزشتہ ماہ فیڈریشن آف چیمبر آف کامرس سے چیف آف آرمی سٹاف جنرل

قمر جاوید باجوہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملکی معیشت کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ یہ کاروباری جرنیل امریکہ سمیت سرمائے کے تمام خداؤں کو بیک وقت خوش رکھنے کی کوشش میں خود ایک دوسرے کے دشمن ہوئے جا رہے ہیں۔ جب بھی زیادہ متشدد اور مشتعل فوجی افسران براہِ راست اقتدار میں آنے یعنی مارشل لا لگا کر ملکی نظم و نسق کو براہِ راست کنٹرول کرنے کے لیے دباؤ بڑھاتے ہیں تو یہ 'حقیقت پسند' شدید مزاحمت کرتے ہیں۔ ان کی ترجیح اب حکومت چلانے سے زیادہ کاروبار چلانے کی طرف ہے اور یہ جانتے ہیں کہ ملکی معیشت کی اس خطرناک صورتحال میں خود اپنی لوٹ مار کو جاری رکھنا ہی محال ہے تو ایسے میں سوشل انفراسٹرکچر کی بحالی کا تو تصور ہی ناممکن ہے۔ تو عوامی دباؤ کا سارا ملبہ سول حکومت پر ہی پڑا رہے تو بہتر ہے، دوسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ماضی میں تمام مارشل لاؤں کی مالیاتی ذمہ داری امریکہ بہادر خود اٹھاتا تھا۔ پاک امریکہ تعلقات کی موجودہ کیفیت خود مارشل لا کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لیے پارلیمان میں موجود سیاسی بندروں کے ذریعے جمہوریت کے سرکس پر ہی اکتفا کرنا افواجِ پاکستان کی 'صحت' اور 'قومی مفاد' کے لیے بہتر ہے۔

فوج کے اندر یہ متحارب دھڑے طاقت کا توازن اپنے حق میں کرنے کے لیے دیگر ریاستی اداروں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ رینجرز اور دیگر پیرا ملٹری ادارے بھی محض کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈوریاں انہی متحارب دھڑوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ مستقبل میں ان اداروں کو بھی جبر کے آلے کے طور پر جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا یہ ادارے بھی خلفشار کی طرف بڑھیں گے۔ جہاں دیگر ریاستی اداروں یا شخصیات کو سماج میں ریاست کی رٹ بحال رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اب افواج کے اندر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان اداروں میں خاص طور پر عدلیہ اور پارلیمان سرِ فہرست ہیں۔ ماضی میں یہ ہوا کرتا تھا کہ افواجِ پاکستان جمہوری ناٹک کی آڑ میں جی ایچ کیو میں بیٹھ کر ایک حکومت بنایا کرتی تھیں اور اس کی خارجہ اور داخلہ پالیسی پر اپنے ہی مہروں کو براجمان کیا جاتا تھا۔ ماضی میں 70ء میں انقلاب کے دباؤ کے باعث کچھ عرصے کے لیے مختلف صورتحال بھی رہی لیکن اس کے علاوہ مملکتِ خداداد کی تمام تر سیاسی تاریخ کا یہی خاصہ رہا ہے۔ خاص طور پر 90ء کی دہائی کے جمہوری ادوار میں یہی ہوتا تھا کہ جب حکومت بین الاقوامی تعلقات یا داخلی طور پر حکمران طبقے یا عوام کے دباؤ کی وجہ سے افواج کی پالیسی کے کسی بھی ایک نکتے سے منحرف ہونے

کی کوشش کرتی تھی تو پاک فوج اپوزیشن کو متحرک کر کے نئی حکومت کی راہ ہموار کر دیتی تھی۔ اس مقصد کے لیے سیاستدانوں کو خریدنا اور بیچنا اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ ماضی کے افواج کے سربراہان اور آئی ایس آئی کے ذمہ داران اب میڈیا پر برملا اس کا اعتراف کر چکے ہیں اور اس کے لیے 'وسیع تر قومی مفاد' کی اختراع کو بطور ڈھال استعمال کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب صورتحال بہت مختلف ہے اور اب بیک وقت حکومت اور اپوزیشن کی تمام پارٹیوں کو افواجِ پاکستان کے مختلف دھڑے سپورٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ عمران خان اور طاہر القادری کے دھرنوں کے وقت فوج کے متحارب دھڑوں کا اختلاف کھل کر سامنے آ گیا تھا جب بہت سے کور کمانڈر نواز شریف کی حکومت گرانے پر بضد تھے مگر نواز شریف کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ آج کل بھی یہی صورتحال ہے مگر ترکیب اور تناسب میں کچھ تبدیلی آنے کی وجہ سے نواز شریف کو اقتدار سے رخصت ہونا پڑا ہے لیکن عمران خان کا نام ابھی تک ویٹنگ لسٹ کی ہی زینت بنا ہوا ہے اور نواز شریف کے بغیر ن لیگ کی حکومت کو چلایا جا رہا ہے۔

نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ کر ریاست کا زیادہ رجعتی دھڑا عمران خان اور اس کے حواریوں کو مسندِ اقتدار پر بٹھانا تو چاہتا ہے مگر خود ان کے بھی عمران خان پر شدید تحفظات ہیں جن کو ہم تفصیل سے کسی اور باب میں زیرِ بحث لائیں گے۔ جب وہ مارشل لا کے ذریعے اقتدار میں اس تبدیلی کو ممکن نہ بنا سکے تو انہوں نے عدلیہ کا سہارا لیا۔ پاناما کا مقدمہ اسی سلسلے کی ہی کڑی تھا۔ 'حقیقت پسند' جانتے تھے کہ جوڈیشل ایکٹوازم کے ذریعے اس طرح کی کوئی بھی تبدیلی پورے نظام کو خطرات سے دوچار کر سکتی ہے۔ اس لیے فوجی اشرافیہ میں کسی بھی قسم کا اتفاقِ رائے پیدا نہ ہونے کی وجہ سے پاناما کے مقدمے کو بہت زیادہ طوالت کا سامنا کرنا پڑا۔ اتفاقِ رائے تو پیدا کیا ہی نہیں جا سکا لیکن جوں جوں مقدمہ طوالت اختیار کر رہا تھا عدلیہ کی اپنی ساکھ کو شدید خطرات لاحق ہونا شروع ہو گئے تھے۔ نواز شریف بدعنوان ہے یہ کوئی ایسی مبہم حقیقت نہیں ہے جسے ثابت کرنے کے لیے عدلیہ میں بہت زیادہ پاپڑ بیلنے پڑیں۔ اس لیے عدلیہ کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ نواز شریف کو مکمل طور پر کلین چٹ دی جا سکے۔ اس لیے انہوں نے ہر ممکن درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے پہلے تو جوائنٹ انوسٹی گیشن ٹیم (JIT) بنا کر جان چھڑالی اور JIT نے بھی ایک ایسا فیصلہ دیا جس پر بیک وقت تحریکِ انصاف اور نون لیگ دونوں نے مٹھائیاں تقسیم کیں۔ بورژوا مفادات کے نکتہ نظر سے بھی یہی ضروری تھا کہ سٹیٹس کو، کو ہی کسی نہ کسی شکل میں جاری رکھا جائے

مگر پاک فوج کے متحارب دھڑوں میں عدم توازن بالآخر عدلیہ کی طرف سے نواز شریف کے خلاف اس کی نااہلی کے فیصلے پر منتج ہوا جس نے ایک نیا پنڈورا بکس کھول کر نئے بحران کو جنم دے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب حکمران طبقات بھی عدلیہ کی ناکارگی اور فرسودگی کو تسلیم کر چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ عدلیہ دہشت گردوں کو کسی قسم کی سزائیں نہیں سنا سکتی کیونکہ اعلیٰ عدلیہ کے اندر بھی بنیاد پرستوں کی بہت بڑی حمایت موجود ہے جس کا اظہار جسٹس شوکت صدیقی کے متنازعہ ریمارکس کے ذریعے ہو چکا ہے۔ بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شوکت صدیقی ایک اکیلا شخص نہیں بلکہ عدلیہ کے غالب دھڑے کا نمائندہ ہے۔ اس لیے دہشت گردی کے مقدمات کے لیے ملک میں فوجی عدالتیں شروع کی گئی ہیں۔ حقیقت میں یہ فوجی عدالتیں بھی دہشت گردوں کی فوجی سرپرستی کی وجہ سے دہشت گردوں کو کم اور آنے والے دنوں میں حقیقی عوامی نمائندوں، طلبہ رہنماؤں اور ٹریڈ یونین کارکنوں کو سزائیں سنانے کے ہی کام آئیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ حال ہی میں مقننہ نے ایک بل کے ذریعے صدیوں پرانے جرگہ سسٹم کو بھی عدالتی نظام کے باقاعدہ دھارے میں شامل کر لیا ہے۔ یہ اس پارلیمان کے ذریعے حقیقی جمہوریت کا خواب دیکھنے والوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔ فوجی عدالتوں اور جرگوں کی قانونی حیثیت کے ہوتے ہوئے عدلیہ کی سماجی افادیت دن بدن ختم ہونے کی طرف جا رہی ہے ویسے بھی نام نہاد اعلیٰ عدلیہ تک رسائی عوام کی بہت بڑی اکثریت کے لیے تو محض ایک خواب ہی ہے۔

اب جہاں اس جوڈیشل ایکٹوازم میں سیاستدانوں کی بدعنوانی بہت زیادہ ایکسپوز ہو گئی ہے وہیں آئی ایس آئی اور پاک فوج کے سابقہ سربراہان اور کچھ حاضر سروس افسران کی بدعنوانی بھی متحارب دھڑوں کی لڑائی کی وجہ سے منظرِ عام پر آ گئی۔ جس کے نتیجے میں جنرل رضوان اختر کو جبری طور پر ریٹائر بھی کرنا پڑ گیا کیونکہ موصوف اربوں روپے کی بدعنوانی میں ملوث ہیں اور ان کا بھائی، جو PIA کا سربراہ تھا، بھی اربوں روپے کی بدعنوانی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ اسی طرح آئندہ دنوں میں اور بہت سے سکینڈلز بھی سامنے آئیں گے۔ یوں فوج کی داخلی لڑائی جہاں خود فوج کے ادارے کے ساتھ وابستہ روایتی تقدس کے پرخچے اڑا رہی ہے وہیں عدلیہ اور پارلیمان کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کر کے ان کو بھی سماج کے سامنے مکمل طور پر ایکسپوز کر رہی ہے۔ اسی لڑائی میں فوج کے سب سے چہیتے سیاستدان شیخ رشید کو برملا کہنا پڑا تھا کہ 'عدلیہ کے پیچھے فوج

کھڑی ہے۔ مستقبل میں بھی عدلیہ کو بار بار یونہی ان لڑائیوں میں گھسیٹا جائے گا اور یونہی عدلیہ سرِ بازار رسوا ہوگی۔ یعنی فوج کے ادارے کا داخلی خلفشار اب پوری شدت سے باہر نکل رہا ہے۔ اس ادارے کا اسی کیفیت میں لاامتناعی طور پر چلتے رہنا خارج از امکان ہے۔

دیگر ریاستی ادارے اور عوام

ریاست کا ایک اور اہم ادارہ پولیس ہے۔ بلکہ کئی حوالوں سے یہ ریاست کا اہم ترین ادارہ بن جاتا ہے کیونکہ افواجِ پاکستان صرف غیر معمولی حالات میں ہی براہِ راست عوام کے آمنے سامنے آتی ہیں لیکن روزمرہ کے ملکیتی تنازعات اور دیگر امنِ عامہ کے مسائل کے نتیجے میں عوام کو پولیس کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ادارے کی بدعنوانی اور لاغری پر تو کسی بھی فردِ واحد کا کوئی ابہام باقی نہیں بچا۔ عوام کے روزمرہ کے لطیفوں اور ضرب الامثال وغیرہ میں بھی پولیس کو بہت لتاڑا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں کراچی میں ایک 'چھرا مار' ذہنی مریض کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی جس کے ہاتھوں درجنوں معصوم خواتین کو شدید ضربیں برداشت کرنا پڑیں۔ یہ سر پھرا کئی دن تک لگاتار اپنی کاروائیاں کامیابی سے کرتا رہا اور پولیس مسلسل ناکام ہوتی رہی حالانکہ تمام کاروائیاں کراچی کے ایک چھوٹے سے رہائشی علاقے تک ہی محدود تھیں۔ لیکن ان کاروائیوں پر عوام کے تاثرات بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ ہر کس و ناکس کا یہی خیال تھا کہ یہ ایجنسیوں کی کارستانی ہے اور خوف و ہراس پھیلانے کے لیے یا دیگر اہم ایشوز سے کراچی کی عوام کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اس چھرے مار کو استعمال کیا جا رہا ہے بالکل ویسے ہی جیسے ماضی میں ایک ہتھوڑا گروپ عوام کی نفسیات پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس سے عوام کے نزدیک ریاست اور اس کے اداروں کی اہمیت اور افادیت کا ادراک ہوتا ہے۔ عوام ریاست سے مکمل طور پر مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سے ذی شعور خواتین و حضرات کے بھی اس چھرے مار کے حوالے سے یہی ریمارکس تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولیس کا ادارہ بھی اتنا گل سڑ چکا ہے اور خود جرائم کی معیشت میں اس حد تک دھنس کر پامال ہو چکا ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ اس طرح کا واقعی کوئی بھی مجرم تھوڑی سی چست چالاکی کا مظاہرہ کرے تو بآسانی اس پولیس کو چکما دے سکتا ہے۔ اس پولیس کا کام اب محض پروٹوکول ڈیوٹیاں کرنا اور حکامِ بالا اور بڑی بڑی شخصیات کے آگے پیچھے دم ہلاتے رہنا ہی رہ گیا ہے اور یہ کام یہ بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔

اسی طرح دور دراز کے دیہات کے علاقوں میں تو پولیس ننگے جبر سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتی۔ کسی بھی سطح پر پولیس کی کوئی اخلاقی ٹریننگ نہیں کی جاتی۔ صرف کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال کمانا ہی ایک پولیس والے کا زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غربت کی چکی میں پستے عوام کو اپنے سیاسی و آئینی و قانونی حقوق کا رتی بھر بھی ادراک نہیں ہوتا اس لیے طاقت کے نشے میں چور یہ ریاستی دہشت گرد عورتوں کی عصمت دری سے لے کر دیگر ہر قسم کے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر اس طرح کی ویڈیوز گردش کرتی رہی ہیں جن میں پولیس کے اس طرح کے جرائم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ کچھ سال قبل سندھ کے ایک پسماندہ علاقے میں ڈاکوؤں نے باقاعدہ احتجاج ریکارڈ کرایا تھا جس میں ان کا کہنا تھا کہ ہم جان جوکھم میں ڈال کر سخت محنت کے بعد روزی روٹی کماتے ہیں اور اس میں سے بھی پولیس کو حصہ دینا پڑتا ہے جو سراسر ناانصافی ہے۔ کراچی میں تو اخبارات بھی ایسی خبریں شائع کرتے رہے ہیں جن میں رینجرز کے کراچی کی پولیس چیک پوسٹوں سے مغویان کو بازیاب کرانے کی اطلاعات تھیں۔ رینجرز کی تاجروں، چھوٹے دوکانداروں اور حتیٰ کہ دیہاڑی داروں سے بھی بھتہ خوری کے قصے اب تو عام ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کراچی میں ابھی حال ہی میں ہونے والی بارشوں میں جب سیلابی کیفیت پیدا ہوگئی تھی تو سوشل میڈیا پر کسی نے ایک ویڈیو شیئر کی جس میں رینجرز اہلکار شہریوں کی پانی میں پھنسی موٹر کاریں وغیرہ نکلوانے میں دھکا لگا کر ان کی مدد کر رہے تھے اور اس کے بدلے ان سے معاوضہ بٹور رہے تھے۔ یہ بدعنوان حکمران طبقات اور افواجِ پاکستان کے متحارب دھڑے بھی پولیس اور رینجرز کو بے دریغ استعمال کرتے ہیں جس کی ایک مثال ہمیں گزشتہ سال سندھ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے بیٹے کے اغوا کے بعد اس وقت نظر آئی جب ق لیگ کے ایک ممبر اسمبلی کی پریس کانفرنس کے بعد سندھ کے وزیرِ داخلہ کے ایک قریبی رشتہ دار کے گھر جسٹس صاحب کے بیٹے کی بازیابی کے لیے چھاپہ مارا گیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس موقع پر رینجرز اور سندھ پولیس ایک دوسرے کے مدِ مقابل دکھائی دیئے۔ مستقبل میں ان اداروں کی جرائم کی معیشت میں شمولیت اور حصے داری کم ہونے کی بجائے اور بھی زیادہ ہوگی جس کے نتیجے میں عوام کی ان اداروں سے اور بحیثیتِ مجموعی ریاست سے نفرت میں اضافہ ہوگا۔

محکمہ مال سے لے کر کسٹم، ایکسائز اور بلدیاتی اداروں تک سول بیوروکریسی کی لوٹ مار بھی اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ ماضی میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ سول سروسز کے امتحانات میں

بدعنوانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ماضی میں کم ہی سہی لیکن بدعنوانی موجود تھی مگر اب تو اس میں بہت بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے اور یہ ایکسپوز بھی ہوئی ہے۔ ویسے اگر وقتی طور پر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس ادارے میں بدعنوانی نہیں ہے اور تمام بیوروکریٹ میرٹ پر منتخب ہوتے ہیں تو پھر بھی اس ادارے کا طریقہ کار اور پیمانہ ایسا ہے کہ کوئی ذہین فطین اور تنقیدی زاویہ نگاہ رکھنے والا شخص شاذ و نادر ہی اس پیمانے پر پورا اترتا ہے۔ عام طور پر اوسط درجے کے زندگی کی دوڑ میں بھیڑ بکریوں کی طرح دوسروں کو پچھاڑ کر تیز بھاگنے اور آگے بڑھنے کی کوشش میں ہر دم مبتلا خواتین و حضرات ہی اس پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ تو پھر ظاہر ہے کہ وہ ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لیے تو افسر نہیں بنتے بلکہ دوسروں کو، خاص طور پر غریب لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھ کر ان پر رعب اور جھوٹی شان مسلط کر کے اپنی ذہنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی دھن ہی ان پر سوار ہوتی ہے، اس لیے وہ عوام پر ہر طرح کا ظلم روا رکھتے ہیں جبکہ خواص یعنی حکمران طبقے کے آگے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ ریاست کے عمومی بحران کے سول بیوروکریسی پر بھی گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور بہت سے اداروں میں فنڈز وغیرہ کی کمی کے باعث بہت سے نئے بیوروکریٹس گاڑی یا دیگر کسی مراعت کی عدم فراہمی کے شکوے شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ اور بھی زیادہ بدعنوانی اور چوری چکاری میں ملوث ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور یوں یہ سماج کی سب سے قابلِ نفرت پرت بنتے جا رہے ہیں۔

پاکستان کا حکمران طبقہ اور ریاستی ادارے عوام سے مکمل طور پر بیگانہ ہو چکے ہیں تو عوام بھی ان کو مکمل طور پر رد کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ حکمران طبقے کی عوام سے لاتعلقی کا سب سے بڑا اظہار میڈیا پر نظر آتا ہے۔ تمام اخبارات اور ٹی وی ٹاک شوز پر کی جانے والی بحثوں کا عوام کی 90 فیصد سے زائد آبادی کی روزمرہ زندگی سے کوئی لینا دینا ہی نہیں۔ اخبارات میں تو پھر بھی کبھی کبھار کوئی 'اہلِ دل' کسی عوامی مسئلے پر کوئی سٹوری کر لیتا ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا پر اس کے امکانات بھی نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ حکمران طبقے کی جعلی اور فروعی لڑائیوں میں عوامی شعور کو الجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹی وی ڈرامے اور فلموں میں بھی اب مکمل طور پر گراوٹ دیکھنے میں آئی ہے۔ ماضی میں پاکستان ٹیلی وژن کے ڈرامے کے زیادہ تر کردار زندہ اور سماج کے نمائندے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب پرائیویٹ انٹرٹینمنٹ چینلز کے اثرات کے باعث پی ٹی وی کے ڈرامے بھی ایک بالکل مختلف دنیا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب عوام کو

اپنے آس پاس وہ دنیا کہیں نہیں ملتی تو ان کی بیگانگی اور احساسِ محرومی کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ گزشتہ کچھ سالوں میں میڈیا سے آبادی کی اکثریت کافی حد تک بیزار ہو چکی ہے۔ زیادہ تر لوگ سمجھتے ہیں کہ ٹی وی ٹاک شوز میں بیٹھے ٹائی کوٹ میں ملبوس تجزیہ نگار کسی نہ کسی سیاستدان یا ریاستی حکام کے زرخرید غلام ہوتے ہیں بلکہ ابھی حال ہی میں لوگوں کو پتہ تھا کہ کون سا ٹی وی چینل کس ریاستی دھڑے کی غمازی کر رہا ہے۔ جیو نیوز نواز شریف کے جلسوں کو تاریخ ساز قرار دے رہا ہوتا تھا تو ARY نیوز عمران خان کو بھٹو سے بھی بڑا عوامی لیڈر بنا کر پیش کر رہا ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک ہی عوامی اجتماع کی مختلف چینلز پر مختلف کوریج دیکھنے میں آئی۔ ایک چینل اسی جلسے کے شرکا کی تعداد لاکھوں میں دکھا اور بتا رہا ہوتا تھا تو ایک بٹن دبانے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ جلسہ گاہ میں کتے بھونک رہے ہیں۔ اس سے عوام میڈیا سے مکمل طور پر بدظن ہی ہوئی ہے اور محض وقت گزاری کے لیے مزاحیہ ڈرامے اور ٹاک شوز ہی دیکھتے ہیں۔ اس وقت ریٹنگ میں وہ پروگرام زیادہ آگے ہیں جن میں سنجیدہ تبصروں کی بجائے جگت بازی زیادہ کی جاتی ہے۔ اس کے متوازی سوشل میڈیا کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے اور لوگ اپنی بھڑاس کھل کر سوشل میڈیا پر نکال دیتے ہیں جس سے لوگوں کے شعور میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے اور ریاست سوشل میڈیا پر پابندیاں لگانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہے۔

مگر یاد رہے کہ محنت کش طبقے کی بھاری اکثریت کی آج بھی سوشل میڈیا تک رسائی ممکن نہیں۔ وہ زندگی کی بنیادی سہولیات کے حصول کی جدوجہد میں ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ مگر نئی نسل کی ریاست اور حکمران طبقے سے یہ بیزاری کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ماضی میں جب بھی ریاست اور بالخصوص فوج کو عوامی حمایت میں کمی یا تنقید کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو وہ سرحد پر کوئی نہ کوئی مہم جوئی شروع کر دیتے تھے۔ کارگل تک یہ کافی کامیاب نسخہ رہا ہے۔ مگر گزشتہ برس ہم نے دیکھا کہ جب بھارت اور ایران کے ساتھ بیک وقت سرحدی جھڑپیں چل رہی تھیں اور میڈیا پر ملی نغمے وغیرہ چلا کر اور زیادہ اونچا اور تیز بولنے والے میڈیا اینکرز کے ذریعے عوام کے جذبات ابھارنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی تو عوام کی طرف سے رسپانس صفر تھا اور جب یہ سرحدی تنازعات معمول بن گئے ہیں تو یہ آزمودہ نسخہ بھی اب کارگر نہیں رہا۔ موجودہ کیفیت میں ریاست کے کسی بھی ادارے پر عوام کا اعتماد موجود نہیں اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی بہتری کی امید ہے بلکہ ریاست کے کسی بھی ادارے سے معمولی سا بھی واسطہ انتہائی تکلیف اور اذیت کا باعث بنتا ہے اور عام لوگوں کی ہر

ممکن کوشش ہوتی ہے کہ اس سے جتنا بچا جا سکے اتنا ہی بہتر ہے خواہ اس کے لیے تھوڑے پیسے زیادہ ہی دینے پڑیں۔ اور جیسا کہ اوپر بحث کی جا چکی ہے کہ تمام ادارے اتنے گل سڑ چکے ہیں کہ وہ کسی بھی عوامی مزاحمت کا راستہ روکنے کی صلاحیت سے نامیاتی طور پر عاری ہو چکے ہیں۔ ان ریاستی اداروں کے اندر بھی لاکھوں کی تعداد میں محنت کش کام کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں عدلیہ کے ملازمین کی ہڑتالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اسی طرح پاکستانی فوج میں بھی بڑی تعداد میں غریب کسانوں کے بچے کام کرتے ہیں جو لمبے عرصے سے اعلیٰ افسران کی عیاشیوں اور مختلف اندرونی محاذوں پر اپنے ساتھیوں کی ہلاکتوں کو بیک وقت گہرائی سے دیکھ اور پرکھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ سب سے زیادہ حکمران طبقات سے نفرت اور بغاوت کا پوٹینشل فوج کی نچلی پرتوں میں مرتکز ہوتا چلا جا رہا ہے جو موقع ملتے ہی اوپری سطحی جبر کو پھاڑ کر اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ جب بھی اس ریاست کو کسی بڑی عوامی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا تو جہاں ایک طرف حکمران طبقات اپنے تمام تر تنازعات اور تضادات سے بالاتر ہو کر، اور ان کے سامراجی آقا بھی اپنے تمام اختلافات بالائے طاق رکھتے ہوئے اس تحریک کو کچلنے کے لیے ریاستی اداروں پر دباؤ بڑھائیں گے کہ وہ عوام پر ننگا جبر کریں، تو یہ ریاست بھی طبقاتی بنیادوں پر تقسیم ہو جائے گی۔

4۔اقتصادی بربریت

گزشتہ باب میں ہم نے تفصیل سے پاکستان کے ریاستی بحران کا جائزہ لیا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ آنے والے سال مملکتِ خداداد کے لیے انتہائی سفاک اور دردناک ثابت ہوں گے۔ ریاست کے اس بحران کے معیشت پر بھی گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔عام طور پر مارکس وادیوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ہر سماجی وثقافتی پیش رفت کو معیشت کی عینک سے دیکھتے ہیں۔اس بہتان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم مارکس وادی معیشت کو ریاست کے بالائی ڈھانچوں،سماجی رشتوں،سیاسی دھارے اور ثقافتی ونفسیاتی عوامل کے ساتھ یکطرفہ اور میکانکی نہیں بلکہ دوطرفہ اور متحرک تعلق میں دیکھتے ہیں۔لیکن ہم سمجھتے ہیں معیشت کا کردار بنیادی اور کلیدی ہوتا ہے۔لیکن بہت سے نام نہاد مارکس وادی معیشت، ریاست اور دیگر بالائی ڈھانچوں کو سمجھنے میں ایک انتہائی اہم غلطی کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے دیگر تمام امور کا تجزیہ بھی سر کے بل الٹا کھڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اور وہ غلطی یہ ہے کہ کسی بھی ریاست کے بحران کی جڑیں محض اسی ملک کی معیشت کے ڈھانچوں میں ہی تلاش کی جاتی ہیں۔اصل میں عالمی معیشت ہی مختلف ریاستوں کے باہمی تعلقات اور داخلی محرکات کا تعین کرتی ہے۔اور کسی بھی ایک ملک میں معیشت، سیاست اور ریاستی ڈھانچوں کا تعلق عالمی معیشت کے ساتھ تعلق میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ عالمی معاشی بحران کے اثرات کسی بھی دوسرے ملک کی معیشت پر ظاہر ہونے سے پہلے اس ملک کی سیاست، سفارتکاری یا ریاستی خلفشار میں اپنا اظہار کریں۔خود عالمی معیشت بھی بڑے سیاسی واقعات جیسا کہ جنگیں، خانہ جنگیاں، انقلابات اور فوجی بغاوتوں وغیرہ سے متاثر ہوتی ہے۔ عالمی معاشی بحران ظاہر ہے کہ جلد یا بدیر تمام معیشتوں پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اس اثر پذیری کی نوعیت اور شدت کا تعین اس ملک کے سیاسی وسماجی ڈھانچے، اسکے تاریخی ارتقا اور ریاستی اداروں کی فعالیت سے ہوتا ہے۔

اس حوالے سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ 2008ء کے عالمی معاشی بحران سے پہلے پاکستان کی

معیشت سرمایہ داری کے کھوکھلے معیارات کے حوالے سے بہت ترقی کر رہی تھی اگر چہ اس ترقی کے ثمرات آبادی کی اکثریت تک نہیں پہنچ رہے تھے۔لیکن اس وقت بھی ریاست کا بحران شدید ہو چکا تھا اور ریاست خود اپنے آپ کے ساتھ برسرِ پیکار تھی۔اور اسی بحران کے زیرِ اثر عالمی معیشت کے بحران سے قبل ہی پاکستان کی معیشت کے غبارے سے ہوا نکلنی شروع ہو چکی تھی۔جیسا کہ 2006ء میں پاکستانی معیشت کی شرحِ ترقی 6.6 فیصد تھی لیکن 2007ء میں یہ کم ہو کر 5.3 تک آ گئی تھی۔ بڑھتے ہوئے گروتھ ریٹ کے باوجود ریاست کے بحران میں کمی آنے کی بجائے شدت آنا معیشت پسندوں (Economic Determinists) کو تو حیران کر سکتا ہے مگر مارکس وادیوں کو نہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں پاکستانی ریاست میں پڑنے والی دراڑوں کا تعلق فقط ملکی معیشت ہی نہیں بلکہ عالمی معیشت کے مصنوعی ابھار کی نوعیت اور کھوکھلے پن سے تھا کیونکہ افغان جنگ کے بعد اس خونی کھلواڑ میں استعمال کی جانے والی سماج کی پسماندہ پرتوں کو واپس معمول کے سماجی دھارے میں لانے کے لیے جس بلند پیمانے کی معاشی اصلاحات درکار تھیں، انکی گنجائش برسوں پہلے ہی ناپید ہو چکی تھی۔

سرمایہ دارانہ معیشت سوویت یونین کے انہدام کے بعد انڈیا، چین، روس اور مشرقی یورپ کی دنیا کی نصف سے زائد آبادی (کی منڈی اور وسائل) کو سرمائے کے براہِ راست تصرف میں لانے کے باوجود اپنے خمیر میں مضمر جان لیوا تضاد پر قابو نہیں پا سکی تھی۔زائد پیداواری صلاحیت کو چین میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کے ذریعے اور عالمی پیمانے پر منڈی کو سستے قرضوں کے سٹیرائیڈز کے بلبوتے پر بروئے کار لایا جا رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی مستقبل میں اس سے بھی زیادہ زائد پیداواریت کے بحران کے بیج بوئے جا رہے تھے۔ایسے میں عالمی معیشت کے اس مصنوعی بلبلے میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ پاکستان جیسے پسماندہ معاشروں کے حکمران طبقات ان ممالک میں جدید انفراسٹرکچر کی تعمیر کے فریضے کو سنجیدہ لیتے۔امریکی حمایت یافتہ پرویز مشرف کے اقتدار پر قبضے کو یہاں کے کچھ لبرلز اور سابقہ بائیں بازو کے لوگ ترقی پسندانہ اقدام سمجھ رہے تھے۔کیونکہ مشرف نے قوم سے اپنے پہلے خطاب میں ملائیت، قبائلیت اور جاگیرداری وغیرہ کو حدفِ تنقید بنایا تھا۔لیکن مشرف کے دس سالہ دورِ اقتدار میں امریکہ کی طرف سے ڈالر تو بے تحاشا آتے رہے مگر صنعتی یا تکنیکی میدان میں کوئی بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری نہ ہو سکی بلکہ ریاست نے ڈبل گیم کے تحت ملائیت کی پرورش کو ان ڈالرز کے حصول کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا اور دو صوبوں میں

ملاؤں کو حکومت بھی دلوائی۔ اسی لیے یہ نام نہاد معاشی ابھار ڈالروں کی زیادتی اور پھر ان ڈالروں کے اوپر ریاست کے رجعتی دھڑوں کی آپس میں نورا کشتی پر منتج ہوا۔

ان حالات میں جب عالمی معیشت کا بلبلہ پھٹا تو پاکستانی معیشت اس دھچکے کو تھوڑے سے وقت کے لیے بھی سہارنے کی اہل نہیں تھی اور عالمی بحران کے بھوکے اژدہے نے فوراً ہی پاکستانی معیشت کو آدبوچا اور 2008ء میں شرحِ ترقی 2.7 فیصد جبکہ 2011ء میں 2.4 فیصد تک آ پہنچی۔ لیکن معیشت کا مکمل طور پر دھڑن تختہ نہ ہونے کی بڑی وجہ ملکی معیشت کو امریکی ڈالروں اور کالے دھن کو پراپرٹی، بینکاری اور سٹاک ایکسچینج کے ذریعے سفید کر کے ملنے والی مصنوعی آکسیجن تھی۔ مگر اب یہ تمام عوامل بھی اپنے منطقی عروج کو پہنچ چکے ہیں اور ان کے نیچے دب کر حقیقی پیداواری معیشت کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس صورتحال میں پاکستان کی ریاست اور حکمران طبقہ ملکی معیشت کا پہیہ رواں رکھنے کے لیے چین کے ساتھ 60 ارب ڈالر کے لگ بھگ سرمایہ کاری کے معاہدے (سی پیک) پر بہت زیادہ انحصار کر رہا ہے لیکن اس منصوبے کے اوائل میں جہاں اس کے زیرِ اثر ریاست کا بحران کم ہونے کی بجائے شدت اختیار کرتا جا رہا ہے وہیں معیشت پر بھی اس کے مثبت کے بجائے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ابھی حکومتی اعداد و شمار کے مطابق شرحِ ترقی 5.5 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ لیکن باقی تمام اعشاریئے مستقبل قریب میں بہت بڑے اور شاید کبھی نہ دیکھے گئے معاشی بحران کا عندیہ دے رہے ہیں۔ یہ معاشی بحران جہاں ریاست کے مذکورہ بالا بحران میں بے پناہ اضافے کا باعث بنے گا وہیں یہ خود عالمی معاشی بحران کے ساتھ ساتھ کسی حد تک اس ریاستی بحران کا نتیجہ اور پیداوار بھی ہے۔

قرضے

پاک امریکہ تعلقات میں کشیدگی کے باعث امریکہ سے ملنے والی امداد بند ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ادائیگیوں کا توازن برقرار رکھنے کے لیے حکمرانوں کو بانڈ مارکیٹ پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے اور ابھی حال ہی میں حکومت نے دو ارب ڈالر کی مالیت سے زائد کے سکوک و دیگر بانڈز جاری کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ پہلے سے موجود قرضوں کے پہاڑ میں ایک بڑا اضافہ ہوگا جس کا بھاری سود چکانا ہوگا۔ اس سے پہلے ہی موجودہ حکومت کو اپنی معاشی پالیسیوں کی ناکامی کی وجہ سے شدید تنقید کا سامنا ہے۔ ایکسپریس ٹریبیون کی 30 جولائی 2017ء کی ایک رپورٹ کے مطابق یہ حکومت

اپنے چار سالوں میں 35 ارب ڈالر کے بیرونی قرضے لے چکی ہے۔ حکومتی ذرائع کے مطابق یہ قرضے زرِمبادلہ کے ذخائر کو مطلوبہ حدف تک رکھنے اور گزشتہ قرضوں کے سود کی ادائیگی کے لیے لینے پڑے۔ وزارتِ خزانہ کے اعداد و شمار کے مطابق جولائی 2013ء سے جون 2017ء تک اس عرصے میں لیے گئے قرضوں کا تقریباً نصف یعنی 17 ارب ڈالر گزشتہ قرضوں اور سود کی ادائیگی میں صرف ہوا۔ یوں بحیثیتِ مجموعی اس حکومت نے کل بیرونی قرضوں کے حجم میں 18 ارب ڈالر کا اضافہ کیا۔ اس وقت پاکستان کا کل بیرونی قرضہ 83 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ صرف آخری سال میں 10.1 ارب ڈالر کا بیرونی قرضہ لیا گیا جو 70 سال کی تاریخ کا ریکارڈ ہے۔ اگر گزشتہ چار سالوں میں لیے جانے والے قرضوں کے حجم کی شرح کو دیکھیں تو صورتحال کی گھمبیرتا کا درست ادراک ہوتا ہے۔ 14-2013ء کے مالی سال میں بیرونی قرضوں کے حجم میں اضافہ 3 ارب ڈالر ہوا، اگلے سال یعنی 15-2014ء میں یہ اضافہ 4.42 ارب ڈالر تھا۔ 16-2015ء میں یہ اضافہ 5.6 ارب ڈالر رہا۔ 17-2016ء میں 10.1 ارب ڈالر کا اضافہ ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی نشے کے عادی شخص کی طرح ملکی معیشت کو ہر دفعہ قرضے کی زیادہ مقدار کے انجیکشن کی ضرورت پڑتی ہے۔ چار سال پہلے جون 2013ء میں ملکی زرِمبادلہ کے ذخائر 6 ارب ڈالر تھے جو جون 2017ء میں 16 ارب ڈالر ہو گئے۔ یہ سارا اضافہ انہی بیرونی قرضوں کے مرہونِ منت تھا۔ اگلے ہی ماہ اس میں مزید 2 ارب ڈالر کی کمی واقع ہوگئی اور زرِ مبادلہ کے ذخائر 14 ارب ڈالر کی کم ترین سطح پر آ گئے جن میں سے 4 ارب ڈالر کمرشل بینکوں سے مختصر مدت کے لیے لیا گیا ادھار ہے۔ یوں درحقیقت سٹیٹ بینک آف پاکستان کے پاس عملاً صرف دس ارب ڈالر کے ذخائر ہیں۔ زرِمبادلہ کے ذخائر کی یہ تشویشناک صورتحال آنے والے دنوں میں مزید بڑے پیمانے کے قرضے لینے پر مجبور کرے گی یہی عالم رہا تو tradingeconimics.com کے ایک تخمینے کے مطابق 2020ء تک بیرونی قرضہ 92 ارب ڈالر سے تجاوز کر جائے گا۔

ان بیرونی قرضوں کے ساتھ ساتھ حکومتِ پاکستان اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ان گزشتہ چار سالوں میں بڑے پیمانے پر ملکی بینکوں سے بھی قرضے لیتی رہی ہے اور یوں اس وقت ملکی اندرونی قرضوں کا حجم 14 ہزار 800 ارب روپے سے تجاوز کر چکا ہے۔ پاور سیکٹر میں 900 ارب روپے کا گردشی قرضہ اسکے علاوہ ہے۔ 25 فروری 2017ء کے ایکسپریس ٹریبیون میں

شائع ہونے والی بلال میمن کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ہر پاکستانی ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ یعنی اس ملک میں پیدا ہونے والا ہر بچہ اپنے ننھے کاندھوں پر اس شدید قرضے کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ تب سے اب تک اس میں پانچ سے سات ہزار روپے کا مزید اضافہ ہو چکا ہوگا کیونکہ یہ اعداد و شمار 31 دسمبر 2016ء تک کے ہیں جس وقت ملک پر کل قرضہ 23 کھرب روپے کے لگ بھگ تھا۔ جوں جوں ملکی معیشت کی صورتحال دگرگوں ہوتی جائے گی مزید قرضوں کے حصول کے لیے زیادہ شرحِ سود پر سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ قرضوں کے حجم کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت اور بھی زیادہ باعثِ تشویش ہے کیونکہ زیادہ تر قرضے کمرشل ذرائع سے حاصل کیے جا رہے ہیں جن کی ادائیگی پانچ سال سے کم عرصہ میں کرنا ہوگی۔ 30 اکتوبر 2017ء کے ڈان میں عزیر یونس نے انکشاف کیا ہے کہ صرف اس رواں مالی سال میں حکومت نے جو کل بیرونی قرضے لیے ہیں انکا 40 فیصد (10 ارب میں سے 4 ارب ڈالر) کمرشل قرضے ہیں جو تین سال سے کم مدت میں ادا کرنے ہونگے۔ مزید برآں جب سے ترقی یافتہ ممالک کی حکومتوں نے اور مرکزی بینکوں نے شرحِ سود بڑھانا شروع کیا ہے پاکستانی حکومت کا ہر آنے والے دن کے ساتھ Floating Rate Debt Instruments پر انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر 2016ء کے جولائی سے لے کر مارچ 2017ء تک لیے جانے والے قرضوں کے 67 فیصد قرضے کی شرحِ سود معین نہیں ہے بلکہ وہ بانڈ مارکیٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ یعنی پاکستانی قرضے اب مکمل طور پر امریکی فیڈرل ریزرو کی طرف سے بڑھائے جانے والی شرح کے آگے بے بس ہونگے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک کیفیت ہے۔ شارٹ ٹرم قرضوں پر بہت زیادہ بڑھے ہوئے انحصار کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ اس وقت پاکستان کے کل بیرونی قرضے کا 22.5 فیصد قرضہ تین سال کی کم مدت میں واجب الادا ہو جائے گا جبکہ 17 فیصد تین سے پانچ سال کی مدت میں واجب الادا ہوگا۔ یعنی حکومت کو 2020ء تک 14 ارب ڈالر کی خطیر رقم ادا کرنا ہوگی۔ اور 2022ء میں مزید 10.3 ارب ڈالر واجب الادا ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی معیشت اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے زیادہ تر ادائیگیاں مزید قرضوں کے مرہونِ منت ہونگی۔ لیکن جوں جوں امریکہ میں بانڈز مہنگے ہوتے جائیں گے حکومت کی مزید قرضے لینے کی استعداد سکڑتی جائے گی۔ عزیر یونس کے الفاظ میں ''ٹریژری بانڈز کو عام طور پر رسک فری (Risk Free) تصور کیا جاتا ہے اور مارکیٹ کے شرکا ان بانڈز کے ریٹ (Rate) میں ابھرتی ہوئی منڈیوں

کے قرضوں کے لیے رسک پریمیم (Risk Premium) کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے ہی دس سالہ ٹریژری بانڈ کا ریٹ بڑھتا ہے ابھرتی ہوئی منڈیوں کے لیے شرحِ سود میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان ملکوں کے لیے مزید قرضے لینا یا پہلے قرضوں کو رول اوور (Rollover) کرنا دشوار ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسے ممالک جو غیر معینہ شرحِ سود پر قرضے لیتے ہیں جیسا کہ پاکستان، ان کو بہت زیادہ شرحِ سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً جوں جوں قرضوں کی ادائیگی کے لیے ضروریات (Requirments) بڑھتی جائیں گی، ویسے ویسے مزید قرضہ دینے کے لیے سرمایہ کاروں کی مانگ میں رسک پریمیم کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ یوں یہ ایک شیطانی چکر ہے جس میں سود کی ادائیگیاں مشکل سے ناممکن ہوتی جائیں گی۔''

قرضوں کا یہ گورکھ دھندا پاکستانی معیشت کو بند گلی میں دھکیل رہا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایسی برق رفتار گاڑی پر سوار ہو جس کی بریک فیل ہو چکی ہو۔ اب یہ گاڑی کہیں بھی کسی بھی وقت اور کسی بھی شے سے ٹکرا سکتی ہے۔ خمیازے کا تخمینہ اس شے کے حجم اور رفتار پر منحصر ہے، جس سے یہ ٹکرائے گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام حقائق کے باوجود مالیاتی منڈی میں آزادانہ کریڈٹ ریٹنگ فراہم کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی سٹینڈرڈ اینڈ پوور (Standard and Poor) نے 31 اکتوبر کے ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستانی معیشت اور مالیاتی آؤٹ لک کو مستحکم قرار دیتے ہوئے اس کی شارٹ اور لانگ ٹرم ریٹنگ B کو بحال رکھا ہے۔ اس سے خود عالمی مالیاتی اداروں کی اپنے ہی نظام کی طرف سنجیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے علاوہ انکے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں۔ وہ اگر پاکستان کو دیوالیہ قرار دیتے ہیں تو سارا قرضہ ڈوب جائے گا۔ اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اس ملک کی عوام کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لینے تک یہاں کے حکمران طبقات کے جھوٹ اور مکر پر مبنی اعداد و شمار اور پالیسیوں پر اندھا یقین بحال رکھیں۔ اگلے ہی دن ڈان نے اپنے اداریے میں اس رپورٹ کے حوالے سے لکھا کہ ''چاہے ہم ایک مالیاتی ایمرجنسی کی کیفیت میں ہیں یا نہیں لیکن بہر حال قرضوں کا حجم بہت زیادہ ہے اور مسلسل کم ہوتے ہوئے ریزرو کی صورت میں سود کی ادائیگیوں کا وزن ہر جاتے مہینے کے ساتھ بڑھتا چلا جائے گا۔۔۔ ہاں، یہ دلیل نہیں دی جا سکتی کہ ہم اس وقت ایک معاشی ایمرجنسی یا بحران کی حالت میں ہیں۔ ابھی تو نہیں۔۔۔ چلو اگرچہ معاملات بہتر ہیں لیکن اس سے یہ مراد نہیں لینی چاہیے کہ معیشت میں سب ٹھیک چل رہا ہے۔ تاہم بیک وقت یہ بھی نہیں سمجھنا

چاہیے کہ ہم بحران جیسی کیفیت سے دوچار ہیں۔'' بورژوازی کے سب سے سنجیدہ اخبار کے اداریئے کی یہ لکنت اصلیت کو بے نقاب کر رہی ہے۔ مصنف کو خود سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اس رپورٹ کو اور ملک کی حقیقی معاشی صورتحال کو کیسے جوڑے۔ لیکن مصنف کا یہ کہنا کہ کم از کم ابھی تو بحران نہیں۔ صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ بحران کی آہٹ ہی نہیں دستک کو سن رہا ہے۔ بہرحال اس حالیہ رپورٹ میں انہوں نے دیگر معاشی اعشاریوں کی بدترین کارکردگی کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا ہے کہ سی پیک کی وجہ سے ہونے والی انفراسٹرکچر اور توانائی کے شعبے کی سرمایہ کاری آئندہ دو سالوں میں پاکستانی معیشت کو پائیدار ترقی کے راستے پر گامزن کر دے گی۔ اس حوالے سے انہوں نے 2017ء سے 2020ء کے دوران پاکستان کی اوسط شرحِ نمو کا تخمینہ 5.7 فیصد لگایا ہے۔ لیکن سی پیک سے ملکی معیشت پر کسی بھی قسم کے مثبت اثرات پڑنے کے امکانات سے ملک کے خود سنجیدہ تجزیہ نگار بھی مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔

سی پیک اور معاشی افراتفری

سی پیک جسے تمام معاشی مسائل کا حل بنا کر پیش کیا جا رہا ہے درحقیقت ایک معاشی قیامت ہے جو پورے معاشی و سیاسی ڈھانچے کو زمین بوس کر سکتی ہے۔ اس پر اس کانگریس پر مفصل تجزیہ ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہاں ہم اس پر سرسری سی نظر ڈالیں گے۔ سب سے پہلے تو سی پیک میں ہونے والے تمام معاہدوں کی پوری فہرست اور تفصیلات ابھی تک عوام کے سامنے پیش ہی نہیں کی گئی ہیں۔ یوں تو کہا جا رہا ہے کہ پاکستانی صنعت اور تجارت کی بڑھوتری اس پراجیکٹ کا سب سے اہم مدعا ہے اور 9 سپیشل اکنامک زون اس منصوبے کے تحت تعمیر کیے جائیں گے لیکن دوسری طرف ابھی سی پیک اپنے ابتدائی مراحل میں ہی ہے اور مختلف شعبوں کے صنعتکاروں نے چینی کمپنیوں کے مال کی بڑے پیمانے پر پاکستانی منڈیوں میں کھپت اور اپنی مسابقت کی نااہلیت کا رونا رونا شروع کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیکسٹائل سمیت پاکستان کی دیگر تقریباً تمام صنعتیں شدید دباؤ کا شکار ہیں۔ صرف کنسٹرکشن سے متعلق صنعتیں کسی حد تک اس پراجیکٹ سے مستفید ہو رہی ہیں۔ لیبر فورس سے لے کر خام مال تک تمام لوازمات چینی کمپنیاں چین سے ہی درآمد کر رہی ہیں۔ اس لیے نہ تو روزگار کے مواقع پیدا ہو رہے ہیں اور نہ ہی پاکستانی مصنوعات کی مسابقت کی صلاحیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سستی چینی مصنوعات

نے پاکستانی منڈی کو مکمل طور پر یرغمال بنالیا ہے۔ چینی مصنوعات کے لیے ملکی منڈی میں سستی اور آسان رسائی کے معاہدے کیے گئے ہیں جو عوام سے چھپائے جا رہے ہیں۔ کسٹم اور ایکسائز ڈیوٹیوں میں بے پناہ چھوٹ نے پہلے سے خستہ حال پاکستانی صنعتوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ فیصل آباد جسے ایشیا کا مانچسٹر بھی کہا جاتا تھا، بیروزگاروں کا دارالخلافہ بنتا جا رہا ہے۔ پاور لومز سیکٹر جس میں دس لاکھ سے زیادہ مزدور کام کرتے تھے تباہی کے دہانے پر ہے۔ مہنگی بجلی اور دیگر مسائل کی وجہ سے پہلے سے تباہ حال صنعت پر سی پیک ایک اور آسمانی آفت کے طور پر وارد ہوا ہے۔ 24 اکتوبر 2016ء کی ایکسپریس ٹریبیون کی ایک رپورٹ کے مطابق 50 فیصد پاور لومز بند ہو چکی تھیں۔ آل پاکستان کاٹن پاور لومز ایسوسی ایشن (APCPA) کے چیئرمین نے واشگاف الفاظ میں تنبیہہ کی ہے کہ اگر یہی صورتحال رہی تو تمام پاور لوم سیکٹر بند ہو جائے گا جس سے لاکھوں لوگ بیروزگار ہونگے۔ اسی طرح سارا ٹیکسٹائل سیکٹر جہاں ملکی لیبر فورس کا 30 فیصد سے زائد کام کرتا ہے تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں سے بیروزگار ہونے والے مزدوروں کی کہیں اور کھپت کے لیے کیا سی پیک کوئی متبادل پیش کر رہا ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2017ء کے ڈان میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ سے ملتا ہے جس کا عنوان ہے 'سی پیک کے ہاتھوں مقامی کاروبار کی شکست'۔ سی پیک کے تحت سب سے بڑی سرمایہ کاری پاور سیکٹر میں کی جا رہی ہے اور اس شعبے میں مقامی صنعتوں کو اس سے کیا فائدہ ہو رہا ہے اس کا اندازہ بجلی کی کیبل بنانے والی کمپنی کے مالک کمال امجد میاں اور اس کی فیملی کے تاثرات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میاں نے ڈان کے نمائندے ناصر جمال کو بتایا کہ پہلے وہ بہت زیادہ پیداواری صلاحیت ہونے کی وجہ سے مزید سرمایہ کاری نہیں کر رہے تھے مگر سی پیک کے بعد جب انکو علم ہوا کہ چین تو انائی کے شعبے میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رہا ہے تو اس نے اپنا تیسرا مینوفیکچرنگ پلانٹ بھی سندر لاہور میں فعال کر دیا۔ لیکن میاں صاحب اب بہت مایوس ہیں اور انکا کہنا ہے کہ چینی سرمایہ کار سارا مال اور ضروری ساز و سامان چین سے درآمد کر رہے ہیں۔ کمال امجد کا مزید کہنا تھا کہ ہم نے گزشتہ مالی سال میں اپنی پیداواری صلاحیت کا صرف 40 فیصد استعمال کیا کیونکہ ہمارے پاس آرڈر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک طرف تو چینی درآمدات کو بڑے پیمانے کی چھوٹ دی جا رہی ہے اور دوسری طرف مقامی صنعت کے لیے درکار درآمدات پر بھاری ٹیکس اور ڈیوٹی عائد کر کے مقامی صنعتکار کی پیداوار کی لاگت کو بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ گزشتہ تین

سالوں میں ان کی پراڈکٹس پر کل وفاقی اور صوبائی ٹیکس میں 45 فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ پیپکو کے ایک افسر سے جب اس حوالے سے معلومات طلب کی گئیں تو اس کا کہنا تھا کہ چینی کمپنیوں کو درآمدات پر اس لیے چھوٹ دی جا رہی ہے تا کہ تمام منصوبے وقت پر مکمل ہو سکیں کیونکہ ہماری مقامی صنعت میں اتنے بڑے پیمانے کی پیداوار کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک اور کیبل مینوفیکچرنگ کمپنی کے سینئر ایگزیکٹو نے حکومت کے اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ 'اگر حکومت کو ہماری پیداواری گنجائش پر شک ہے تو انہیں ہم سے بات کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارے پاس زیادہ آرڈر ہونگے تو ہم اپنی سرمایہ کاری اور پیداواری صلاحیت کو بڑے پیمانے پر بڑھانے کے اہل ہیں۔ اگر بالفرض ہم اس میں ناکام ہوتے ہیں تو حکومت چینی کمپنیوں کو فوری درآمدات کی اجازت دے سکتی ہے۔ لیکن ہمیں مقابلے سے بالکل باہر رکھنا اور پھر یہ کہنا کہ مقامی صنعت اور روزگار کو فائدہ ہوگا ناقابلِ فہم ہے۔'' یاد رہے کہ کمال امجد کی کیبل مینوفیکچرنگ کمپنی کو اسی سال کے شروع میں اپنی درمیانے اور کم وولٹیج کی کیبلز کے شاندار بین الاقوامی معیار پر ہالینڈ سے KEMA گولڈ سرٹیفیکیٹ بھی ملا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ہم اپنے صرف ایک پلانٹ کو 100 فیصد پیداواری صلاحیت پر چلائیں تو فوراً 300 نئے روزگار پیدا کر سکتے ہیں۔ کمال امجد نے مزید کہا کہ اب ایک چینی کیبل مینوفیکچرنگ کمپنی یہاں پر پلانٹ لگا رہی ہے لیکن اس میں چینی مزدور کام کریں گے اس لیے حکومت کو چاہیئے کہ وہ چینی سرمایہ کاروں کو پابند کریں کہ وہ مقامی مزدوروں کو روزگار دیں۔ لیکن چین کے اندر بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے باعث چینی سامراجی اس پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ سی پیک درحقیقت سامراجیت کی بدترین شکل ہے۔

اس سامراجی منصوبے کا پردہ فاش کرنے کے لیے ایک اور مثال دی جا سکتی ہے کہ اس وقت پاکستانی معیشت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ریکارڈ تجارتی اور کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ ہے۔ اس وقت پاکستان کا سالانہ کرنٹ اکاؤنٹ خسارا 12.1 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے جو گزشتہ برس 4.86 ارب ڈالر تھا۔ 30 اکتوبر کے ڈان میں جاوید ماجد خان کا ایک کالم 'تباہی کے دہانے کی طرف دوڑتی معیشت' کے نام سے شائع ہوا ہے جس کے مطابق صرف جولائی سے اگست کے دوران پاکستان کی درآمدات 8.98 ارب ڈالر رہی ہیں جبکہ اسی عرصے میں برآمدات صرف 3.93 ارب ڈالر تھیں۔ یوں ان تین ماہ میں تجارتی خسارہ 5.05 ارب ڈالر بنتا ہے جو گزشتہ برس اسی دورانیے میں 3.69 ارب ڈالر تھا۔ سٹیٹ بینک کی حالیہ سالانہ رپورٹ کے مطابق کرنٹ

اکاؤنٹ خسارے میں اتنے بڑے اضافے کی بنیادی وجہ ملک کی درآمدات کے بل میں ہونے والا 17 فیصد کا اضافہ ہے اور رواں مالی سال 2017ء میں کل درآمدی بل 48.6 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ جبکہ گزشتہ تین سالوں سے برآمدات مسلسل گر رہی ہیں اور اس وقت تجارتی خسارہ 32.5 ارب ڈالر کی ریکارڈ سطح پر پہنچ چکا ہے۔ برآمدات میں اصل ویلیو کی حد تک ہی نہیں بلکہ GDP کی شرح کے حوالے سے بھی بڑی کمی ہو رہی ہے جو بورژوا معیشت کے حوالے سے بے حد خطرناک امر ہے۔ ابھی تک تو یہ سارا خسارا کسی حد تک بیرونِ ملک کام کرنے والے محنت کشوں کی بھیجی ہوئے ترسیلاتِ زر سے پورا کیا جا رہا ہے جو اس سال 19.3 ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں مگر آئندہ برس سے خلیجی ممالک کے بحران کے باعث ان میں بھی بڑے پیمانے کی گراوٹ متوقع ہے کیونکہ سعودی عرب غیر ملکی مزدوروں پر بڑے پیمانے پر ٹیکس لگا رہا ہے جس کے باعث لاکھوں محنت کشوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے لیکن قوتِ خرید کے حوالے سے یہ 24 ویں نمبر پر ہے۔ اور GDP کے حوالے سے 42 ویں نمبر پر ہے یعنی پاکستان کا GDP کا کل حجم آبادی کی تناسب سے بہت کم ہے جس کی وجہ سے GDP فی کس 1629 ڈالر بنتا ہے جو دنیا میں 147 واں نمبر ہے۔ اس سے بھی تشویشناک امر GDP کی ترکیب (Composition) کا معیار ہے جو GDP کے کم حجم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان کی مالی سال 17-2016ء کی رپورٹ کے مطابق ''داخلی مانگ کی طرف سے GDP میں کھپت کا حصہ 94 فیصد تک بڑھ چکا ہے جو گزشتہ عشرے میں 90 فیصد تھا۔ گھریلو کھپت کا حصہ گزشتہ عشرے کے 80.4 فیصد سے بڑھ کر 81.8 فیصد ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے GDP کے باقی عناصر کا حصہ بہت ہی کم رہ جانے کے باعث ساختیاتی عدم توازن بہت بڑھ گیا ہے۔ مانگ کے حوالے سے GDP کی پیمائش کھپت کی سطح، حکومتی اخراجات اور برآمدات میں سے درآمدات کو منفی کرنے کے بعد حاصل ہونے والے اعداد کے حاصل جمع سے کی جاتی ہے۔ رواں مالی سال میں اگرچہ آخری کوارٹر میں ہلکی سی بہتری آئی ہے مگر پھر بھی GDP میں برآمدات کا حصہ منفی میں ہے۔ خدمات کا شعبہ ملکی معیشت کا سب سے بڑا اور سب سے تیزی سے بڑھنے والا سیکٹر ہے مگر اس کا برآمدات میں حصہ نہ ہونے کے برابر ہے''۔ اسکے ساتھ ساتھ دیگر صنعتوں میں استعمال ہونے والی صنعتی اشیا (Capital Goods) کی درآمدات میں بڑے

پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ داخلی مانگ مقامی پیداوار سے پوری نہیں ہو پا رہی۔ اس میں بھی چین کے ساتھ کیے جانے والے معاہدوں کا بہت عمل دخل ہے۔ مالی سال 2017ء میں مشینری کی درآمدات 11.8 ارب ڈالر رہیں جن میں 37.1 فیصد کا اضافہ ہوا جبکہ نجی شعبے کے کل قرضوں (747.9 ارب روپے) کا ایک تہائی معینہ سرمایہ کاری (Fixed Investment) کے مقاصد کے لیے تھا۔ بڑھتے ہوئے تجارتی خسارے کے معذرت خواہان اسی بڑے پیمانے کی مشینری کی درآمدات کو ڈھال بنا رہے ہیں، انکی دلیل یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے کی مشینری آنے سے ملکی پیداواریت بڑھ رہی ہے جو آنے والے دنوں میں ملکی معیشت کو بحران سے نکالنے میں کلیدی کردار ادا کرے گی لیکن بالفرض ہم یہ مان بھی لیں کہ پیداواریت بڑھ جائے گی مگر داخلی منڈی میں اسکی مناسبت سے مانگ میں اضافے کے لیے جو دیگر معاشی لوازمات درکار ہیں ان کا کیا ہو گا۔ اس پر مجرمانہ خاموشی اس حکمران طبقے کے سامراجیوں پر انحصار اور دارومدار کی غمازی ہے۔ داخلی مانگ بڑھانے کے لیے روزگار کے مواقع بڑھانا شرط ہے جبکہ اس ساری سرمایہ کاری سے روزگار بڑھنے کی بجائے کم ہو رہا ہے اور منڈی میں چینی مصنوعات مسلسل بڑھ رہی ہے جو لوکل انڈسٹری کو مزید سکیڑ کر مزید بیروزگاری کو جنم دیں گی۔ اوپر ہم کیبل مینوفیکچرنگ انڈسٹری اور ٹیکسٹائل کی مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ مزید برآں مشینری کو نکال کر بھی درآمدات میں 19 فیصد کا اضافہ ہے جس کا بڑا حصہ کنزیومر گڈز پر مشتمل ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ چین سے بڑے پیمانے کی عام استعمال کی تیار اشیا بھی درآمد کی جا رہی ہیں۔

تجارتی خسارے کی بڑی وجہ پاکستانی صنعت کی عالمی منڈی میں مسابقت کی صلاحیت کا نہ ہونا ہے اور ساتھ ہی پاکستان کی برآمدات بہت کم آئٹمز پر مشتمل ہیں جن میں کاٹن اور کاٹن کی مصنوعات، لیدر، چاول یا چند دیگر مصنوعات شامل ہیں۔ ان مصنوعات کا 17-2016ء میں پاکستانی برآمدات میں حصہ 72 فیصد تھا جن میں صرف کاٹن اور کاٹن کی مصنوعات کا حصہ 60.1 فیصد تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اب لیدر اور ٹیکسٹائل کی Finished گڈز کی درآمدات پر بھی سٹینڈرڈ سیلز ٹیکس 17 فیصد کو کم کر کے 6 فیصد کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی حکومت کی ترجیحات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح پاکستانی برآمدات میں سے زیادہ تر پرائمری اور انٹرمیڈیٹ گڈز ہیں اور مکمل تیار شدہ Value Added پراڈکٹس بہت کم ہیں۔ مثال کے طور پر 74 فیصد غذائی اجناس اور 40 فیصد ٹیکسٹائل برآمدات پرائمری اجناس ہیں۔ عالمی منڈی میں شدید

مسابقت کے باعث برآمداتی شعبہ جات میں سرمایہ کاری مسلسل کم ہورہی ہے۔اسی طرح پاکستان کو بڑے پیمانے کی بیرونی منڈیاں بھی دستیاب نہیں ہیں اور جو منڈیاں دستیاب ہیں وہ بھی عالمی بحران کی وجہ سے مانگ کی قلت کا شکار ہوتی جارہی ہیں۔ 50 فیصد پاکستانی برآمدات صرف چھ ممالک تک محدود ہیں جن میں امریکہ، چین، متحدہ عرب امارات، برطانیہ اور جرمنی شامل ہیں۔ پاکستانی معیشت کی سب سے بڑی کمزوری ریجنل تجارت سے بڑے پیمانے کی لاتعلقی ہے جس میں ریاست کے بحران نے ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے اور سب سے بڑھ کر ریجن میں صرف چین کے ساتھ تجارت پر غیر معمولی انحصار کے باعث دیگر ریجنل تجارتی شراکت داروں کی ضرورت سے ہی منہ موڑ لیا جاتا ہے۔ اب ریاست کا ایک حصہ پڑوسیوں سے اچھے تجارتی تعلقات کی ضرورت کو محسوس کر رہا ہے۔اگر تجارت کے اعداد و شمار پر نظر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا مجموعی ریجنل تجارت میں حصہ تیزی سے سکڑ رہا ہے اور ساتھ ہی سارک کے ہر رکن کے ساتھ انفرادی تجارت میں بھی کمی ہورہی ہے۔سٹیٹ بینک کی مالی سال 2017ء کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ تین سالوں میں ریجنل برآمدات 2015ء کی 3.1 ارب ڈالر سے کم ہوکر 2017ء میں 2.5 ارب ڈالر ہوگئی ہیں۔ جبکہ اسی دوران ریجن سے درآمدات 1.58 ارب ڈالر سے بڑھ کر 1.98 ارب ڈالر ہوگئی ہیں۔ یوں خطے میں پاکستانی تجارت کا حجم 4.71 ارب ڈالر سے کم ہو کر 4.40 ارب ڈالر رہ گیا ہے۔افغانستان کے ساتھ دوطرفہ تجارت 1.7 ارب ڈالر سے کم ہوکر 1.1 ارب ڈالر رہ گئی ہے جبکہ اب چاہ بہار کے راستے انڈیا کی افغانستان سے تجارت شروع ہوگئی ہے۔ابھی کچھ دن پہلے ہی گندم کی پہلی شپمنٹ تحفتاً افغانستان پہنچ گئی ہے۔ایسے ہی بنگلہ دیش سے پاکستان کی دوطرفہ تجارت 0.74 ارب ڈالر سے کم ہوکر 0.68 ارب ڈالر ہوگئی ہے۔ایران سے 0.31 ارب ڈالر سے کم ہوکر 0.30 ارب ڈالر رہ گئی ہے۔ جبکہ سری لنکا سے 0.54 ارب ڈالر سے کم ہوکر صرف 0.10 ارب ڈالر ہوگئی ہے۔اگرچہ انڈیا کے ساتھ تجارت میں اضافہ ہوا ہے جو 2015ء میں 1.8 ارب ڈالر سے بڑھ کر 2017ء میں 3.1 ارب ڈالر ہوگئی ہے مگر اس میں بہت بڑا حصہ درآمدات کا ہے۔انہی وجوہات کی بنیاد پر خواجہ آصف بھی یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ پاکستان کو بہت تیزی سے پالیسی شفٹنگ درکار ہے۔

اس وقت تجارتی خسارے میں جو ریکارڈ اضافہ ہوا ہے اسکا بھی بڑا کریڈٹ سی پیک کو جاتا ہے۔ کیونکہ کل 32.5 ارب ڈالر کے تجارتی خسارے میں بڑا حصہ چین کے ساتھ تجارتی خسارہ

ہے۔ بزنس ریکارڈر کی رپورٹ کے مطابق 13-2012ء میں سی پیک کی عنایات سے قبل پاکستان کا چین سے تجارتی خسارہ 4.032 ارب ڈالر تھا جو اب بڑھ کر 12 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے جو رواں مالی سال کے کل کرنٹ اکاؤنٹ خسارے کے برابر ہے جبکہ اس وقت دونوں ملکوں کے مابین تجارت 18.9 ارب ڈالر ہے۔ کامرس اور تجارت کے وزیر محمد پرویز ملک نے قومی اسمبلی میں سوالات کے جوابات کے دوران بتایا کہ پاکستان کی چین سے درآمدات رواں سال 17-2016ء میں بڑھ کر 14.13 ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہیں جبکہ اس سال برآمدات صرف 1.5 ارب ڈالر تھیں۔ جبکہ 16-2015ء میں برآمدات 1.7 ارب ڈالر تھیں اور درآمدات 12.11 ارب ڈالر تھیں یعنی خسارہ 10.44 ارب ڈالر کا تھا۔ چین کے ساتھ اتنے بڑے تجارتی خسارے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ صرف 2016ء میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کی ایک رپورٹ کے مطابق چین نے پاکستان کی چین کو برآمدات پر 87 ٹیکنیکل رکاوٹیں (TBT) مسلط کیں جن میں جانوروں کے تیار چارے پر 33، کیمیکلز اور الائیڈ انڈسٹریز پر 51 رکاوٹیں شامل ہیں۔ لیکن جہاں ایک طرف ملکی مصنوعات کا معیار واقعی غیر معیاری اور صحت کے لیے غیر موزوں ہے وہیں یہاں کے حکمران طبقات بھی چین کے آگے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں، اس لیے ان تکنیکی رکاوٹوں کی حقیقی صحت پر حکمرانوں اور انکے نمائندوں کی طرف سے سوال اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں پاکستان کے موجودہ تجارتی خسارے میں بہت بڑا حصہ سی پیک کا ہے جسے مملکتِ خداداد کے لیے بہت بڑی نعمت بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور تجارتی خسارے کا سارا نزلہ روپے کی قدر کے زیادہ (Overvalued) ہونے پر ڈالا جا رہا ہے حالانکہ اس کی بنیادی وجہ سارے معاشی ڈھانچے کی خستہ حالی اور اس پر تاریخ کی بدترین سامراجی غلامی کی شکل یعنی سی پیک ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ سی پیک کے منصوبے کے تحت متوقع 60 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری درحقیقت انتہائی مہنگے قرضے ہیں جو پاکستان کو سود سمیت واپس چکانے ہونگے۔ مثال کے طور 29 ستمبر کے دی نیوز کی ایک خبر کے مطابق ابھی تک سی پیک کے تحت توانائی اور دیگر شعبوں کے مختلف منصوبوں کی مد میں جو قرضے حاصل کیے گئے ہیں ان کے عوض پاکستان کو 2024ء تک 100 ارب ڈالر چکانے ہونگے۔ چینی ذمہ داران کا اس حوالے سے یہ کہنا ہے کہ یہ قرضے پاکستانی حکومت نے نہیں لیے بلکہ پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے والی چینی کمپنیوں نے لیے ہیں اور انکو چکانے کی ذمہ داری بھی انہی کمپنیوں

پر عائد ہوتی ہے۔ اگر اس جواز کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ کمپنیاں یہ پیسے اپنی جیب سے ادا کرنے سے تو رہیں بلکہ یہ تمام رقم پاکستانی معیشت کو ہی نچوڑ کر ادا کی جائے گی اور ان کمپنیوں کا اربوں ڈالر کا اپنا منافع الگ ہوگا۔ اس خطیر رقم میں اگر 2020ء تک واجب الادا ہونے والے 14 ارب ڈالر اور 2022ء تک واجب الادا ہونے والے 10.3 ارب ڈالر کے قرضہ جات بھی شامل کر دیئے جائیں تو صورتحال کی سفاکی اور کٹھنائی کا واضح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے ان آئندہ سات سالوں میں جو مزید قرضے لینے پڑیں گے انکی سود سمیت ادائیگیاں بھی یہاں کے محنت کش طبقے کو ہی کرنی ہونگی۔ اس کیفیت پر بندگلی کی ترکیب انتہائی عاجزانہ اور خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ جب بھی کسی ماہرِ معیشت سے اس بندگلی سے نکلنے کا راستہ پوچھا جاتا ہے تو وہ سی پیک کے منصوبوں کی تکمیل میں ہر ممکنہ برق رفتاری اور پھر اس کے ثمرات کی تیز ترین منتقلی کو نسخہ کیمیا بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسے میں میر تقی میر کا وہ شعر بہت یاد آتا ہے کہ

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

حکومت کئی بار یہ تسلیم کر چکی ہے کہ تجارتی خسارے کی بہت سی وجوہات میں سے سب سے بڑی وجہ مانیٹری اور ٹیرف پالیسی کا تضاد ہے۔ ایک طرف تو لوکل انڈسٹری کے لیے مشینری کی درآمد پر بھاری ٹیکس عائد ہیں جبکہ چین کو درآمدات میں کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔ دوسری طرف روپے کی قیمت کو بھی مصنوعی طور پر 105 روپے کے ڈالر کی حد پر برقرار رکھا گیا ہے جبکہ روپے کی اصل قیمت فی ڈالر 130 روپے بتائی جا رہی ہے۔ گزشتہ عرصے میں یورو کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں 11 فیصد تک کم ہوئی ہے۔ اس حوالے سے پاکستانی برآمدات کی مسابقت کی صلاحیت کا سکڑنا ناگزیر ہے۔ روپے کو اس سطح پر رکھنے کی یہ حکمران کوئی بھی وجہ بتائیں حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی دولت کو بڑے پیمانے پر بیرونِ ملک منتقل کرتے ہیں اور اس میں روپے کے بدلے زیادہ ڈالر بٹورنے کے لیے قیمت کم رکھی گئی ہے۔ دوسری طرف اب پالیسی ساز اچانک قیمت کم کرنے سے بڑے پیمانے پر افراطِ زر سے بھی خوفزدہ ہیں۔ دو اکتوبر کے ڈان میں جاوید بخاری لکھتے ہیں کہ ''موجودہ گروتھ بنیادی طور پر داخلی مانگ کی وجہ سے ہے۔ اگر قومی کرنسی کی قدر میں کسی بھی قسم کی کمی کی گئی تو کنزیومرز کی قوتِ خرید کم ہو جائے گی جس سے داخلی منڈی سکڑ جائے گی۔''
مزید اسی مضمون میں موصوف کا کہنا ہے کہ ''ایک مستحکم قومی کرنسی قیاس آرائیوں پر مبنی عالمی منڈی

کے تبادلہ کے ریٹ اور روپے کی قوتِ خرید کی برابری یعنی ڈالر اور دیگر بین الاقوامی کرنسیوں کے ساتھ روپے کے حقیقی تبادلے کے ریٹ میں خلیج کو کم کر رہی ہے''۔ یہ دلائل کافی حد تک درست معلوم ہوتے ہیں لیکن تجارتی خسارے میں کمی کا مانیٹری ایڈجسٹمنٹ کے علاوہ کوئی اور حل فی الحال دکھائی نہیں دے رہا۔ اور اگر یہ ایڈجسٹمنٹ ابھی ایک منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہو پاتی تو پھر عین ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں ہی روپے کی قیمت میں تیز ترین کمی حکومت کے کنٹرول کے بغیر ہو اور یہ فری فال پوری معیشت کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس سے ایک تو قرضوں کے حجم میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا اور مزید قرضے بے پناہ مہنگے ہو جائیں گے۔ برآمدات میں اگرچہ اضافہ ہوگا لیکن اس کے اثرات معیشت میں کسی قسم کی بہتری کا باعث نہیں بنیں گے کیونکہ درآمدات اسی مناسبت سے مہنگی ہو جائیں گی اور ساتھ ہی ساتھ میں درآمدات میں اضافے کا رجحان بھی برقرار رہے گا۔ یوں روپے کی قیمت کو چاہے ایک کنٹرولڈ طریقے سے کم کیا جائے یا ایک فری فال دیکھنے میں آئے معیشت کو ایک بہت بڑے دھچکے سے بچانے کی آپشنز ہر آنے والے دن کے ساتھ محدود ہوتی جا رہی ہیں۔

خسارے کو پورا کرنے کے حکومت کے پاس دو روایتی طریقے ہی بچتے ہیں، ایک تو نجکاری کا نسخہ ہے جس پر ہم بعد میں بات کریں گے اور دوسرا ریونیو جنریشن میں اضافے کا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ٹیکسوں کی وصولی میں کسی حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے اور GDP کے 9 فیصد سے ٹیکس کی شرح GDP کے 11 فیصد تک پہنچ گئی ہے لیکن عالمی معیارات کے مطابق یہ ابھی بھی بہت کم ہے۔ اس مالی سال 17-2016ء کے لیے 28 ستمبر تک فیڈرل بورڈ آف ریونیو صرف 178945 ٹیکس ریٹرنز ہی جمع کر پایا تھا اور حکومت دوسری بار ٹیکس ریٹرنز جمع کروانے کی آخری تاریخ میں 31 اکتوبر تک کی توسیع کا سوچ رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک حکومت نے ٹیکسوں کی وصولی میں جتنا بھی اضافہ کیا ہے وہ زیادہ تر عوام پر لگائے گئے بالواسطہ ٹیکسوں کی وصولی سے کیا گیا ہے جبکہ براہِ راست ٹیکسوں میں اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر جولائی سے ستمبر 2017ء کی سہ ماہی میں فیڈرل بورڈ آف ریونیو نے ٹیکس کی مد میں 765 ارب روپے جمع کیے جبکہ ان کا صرف 7.6 فیصد براہِ راست ٹیکسوں پر مشتمل ہے اور باقی تمام بالواسطہ اور ود ہولڈنگ ٹیکس تھے۔ آنے والے دنوں میں یہ حکومت اور آئندہ حکومتیں بھی عوام پر جی ایس ٹی اور دیگر مختلف ناموں سے نئے نئے ٹیکس عائد کرنے پر مجبور ہوں گی۔ بیرونی ممالک سے آنے والے

ترسیلاتِ زر میں ممکنہ بڑے پیمانے کی کمی اور اس سے افراطِ زر میں اضافے کی صورت میں یہ ٹیکس عوام کے خون کے ساتھ ساتھ انکی ہڈیوں سے بچا کھچا گودا بھی کھینچنے کی طرف جائیں گے۔ ایسے میں GDP کی شرحِ نمو اگر 4 سے 5 فیصد کے بیچ برقرار رکھنے میں حکمران کامیاب بھی رہتے ہیں تو تب بھی عوام کے معیارِ زندگی میں تیز ترین گراوٹ ناگزیر ہے۔

بینکنگ، رئیل اسٹیٹ اور سٹاک ایکسچینج

پاکستان کا بینکنگ کا شعبہ 2008ء کے معاشی بحران کے باوجود مستحکم رہا۔ ایسے وقت میں جب دنیا کے بہت بڑے بڑے بینک دیوالیہ ہو رہے تھے، پاکستان کے بینک اربوں روپے کا منافع بٹورتے رہے اور انکا معاشی پھیلاؤ بھی زبردست رہا۔ مگر یہ سب بینکنگ کے اصل کردار کو پسِ پشت ڈال کر کیا جا رہا تھا۔ بینکوں کا حقیقی کام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ کاروں کو سستے قرضے مہیا کریں تاکہ ملکی معیشت کا پہیہ تیزی سے چلتا رہے اور روزگار کے مواقع بھی پیدا ہوتے رہیں۔ مگر ایک طرف تو پاکستان کے سرمایہ دار اپنے تاریخی ارتقا کی نوعیت کے باعث جبلی طور پر شدید بدعنوان واقع ہوئے ہیں۔ محنت کشوں کا ظالمانہ استحصال کرنے کے باوجود ٹیکس اور بجلی چوری کیے بغیر یہ اپنے شرحِ منافع کو برقرار ہی نہیں رکھ سکتے۔ ساتھ ہی بینکوں سے بڑے پیمانے پر قرض لے کر ان قرضوں کو اپنی نمائندہ حکومتوں کے ذریعے معاف کروا کر یہ اپنی لوٹ مار اور تعیش کو برقرار رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے پاکستانی بینکوں نے روایتی طریقہ کار سے ہٹ کر اتنے بڑے پیمانے کے پھیلاؤ کو جنم دیا ہے۔ ایک طرف تو کالی معیشت سے آنے والی بڑی رقم کو ان بینکوں نے سفید کرتے ہوئے بھاری لیکویڈیٹی حاصل کی اور دوسری طرف اس بھاری رقم کو حکومت کی لمبے عرصے تک چلنے والی انتہائی ڈھیلی اور لچکدار مانیٹری پالیسی سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے بڑے پیمانے پر حکومتی قرضوں میں انویسٹ کیا۔ مارکس وادی اس وقت سے ہی اس پالیسی کی حساسیت کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ کیونکہ اس پالیسی کے تحت بینکنگ کے شعبے کی فعالیت کا انحصار بینکنگ کے شعبے کے اپنے ٹھوس اور پائیدار معاشی ڈھانچے کی بجائے مسلسل اور بدستور کئی بحرانوں میں گھری پاکستانی حکومتوں کی مالیاتی پالیسی پر تھا۔ اور حکومتوں کے لیے بھی اس ڈھیلی ڈھالی مانیٹری پالیسی کو لامتناعی طور پر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا اور بالآخر اب بینکاری کے شعبے کے اچھے دن اختتام پذیر ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔

سادہ الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ بینک گزشتہ ایک عشرے سے گورنمنٹ پیپرز میں آسان ترین سرمایہ کاری کے ذریعے بڑے پیمانے کے منافع کما رہے تھے۔لیکن پھر بینکوں کی مالیاتی استطاعت کو 2015ء کے درمیانی عرصے سے اس وقت چیلنجز کا سامنا ہونا شروع ہوا جب سٹیٹ بینک آف پاکستان نے اپنے مانیٹری پالیسی ریٹ میں کمی کرنا شروع کی۔2 مئی 2017ء کی پاکستان ٹوڈے کی رپورٹ کے مطابق بینکوں نے 3 سال قبل اپنے Deposits کا 30 فیصد یعنی 1.2 ٹریلین روپے پاکستان انوسٹمنٹ بانڈز (PIBs) میں انویسٹ کیے تھے اس وقت پالیسی ریٹ 12 فیصد تھا جس پر بینکوں نے بڑے منافع بٹورے۔لیکن اب چونکہ یہ بانڈز میچور ہو چکے ہیں تو بینک مجبور ہیں کہ دوبارہ PIBs میں ہی سرمایہ کاری کریں مگر اب پالیسی ریٹ 6 فیصد سے بھی کم ہے۔گزشتہ سال یعنی مئی 2016ء سے پالیسی ریٹ 5.75 فیصد ہے یہ گزشتہ 45 سالوں کی کم ترین سطح ہے۔گزشتہ دس سالوں سے مسلسل زیادہ پالیسی ریٹ کی وجہ سے حکومت کے تین سالہ، پانچ سالہ اور دس سالہ مدتی PIBs کے اجرا سے بینکوں کے لیے زیادہ Deposits بنانا آسان تھا اور ان سالوں میں انکا پھیلاؤ (Risk Free Spread) اوسط 5 فیصد سے 7 فیصد رہا جس سے ملکی شرحِ نمو کو بھی سہارا ملتا رہا مگر اب یہ اچھے دن قصہ پارینہ ہو چکے ہیں۔اور اب بینکنگ سپریڈ تیزی سے سکڑ رہا ہے۔

9 ستمبر 2017ء کے ڈان میں شاہد اقبال کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بینکنگ کے شعبہ کے اثاثے (Asset Base) 2017ء کے دوسرے کوارٹر میں 8.3 فیصد بڑھے ہیں جو کہ 2008ء سے اب تک متعلقہ کوارٹر میں سب سے بڑی شرحِ ترقی ہے۔تاہم سٹیٹ بینک آف پاکستان کے بینکنگ سیکٹر کے ریویو کے مطابق بینکنگ کے شعبے کی منافع خوری 2017ء کے پہلے نصف میں کم ہوئی ہے۔بینکوں کی منافع کی شرح کم شرحِ سود کے ماحول میں کم ہی رہنے کی توقع ہے۔17 جولائی 2017ء کی پاکستان اکانومسٹ ڈاٹ کام کی ایک رپورٹ کے مطابق ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد 2017ء کے پہلے کوارٹر میں بینکوں کا منافع 49 ارب روپے رہا جو گزشتہ سال کے اسی دورانیے کے 52 ارب روپے کے مقابلے میں 7.2 فیصد کم تھا۔اب بینکوں کے لیے تشویشناک ماجرا یہ ہے کہ ان کو آسان اور سستے منافعوں کی لت لگ چکی ہے اور جہاں ایک طرف اب حکومتی قرضوں میں سرمایہ کاری سے منافعوں کی شرح میں بڑھوتری کی بجائے کمی ہی متوقع ہے، وہاں دوسری طرف نجی شعبے اور خاص طور پر پیداواری شعبے کی شرحِ ترقی بھی نہ ہونے کے

برابر ہے۔اس حوالے سے بینکوں کا نجی شعبے کی طرف ہچکچاہٹ پر مبنی رویہ بھی تبدیل ہونا اتنا آسان دکھائی نہیں دیتا۔بینکوں کے نجی شعبے کے قرضوں کی طرف محتاط رویے کی وجہ ملک کی عمومی معیشت کے بحران کے باعث بڑے پیمانے کے دیوالیہ پن کے اندیشے تھے۔جیسا کہ 2008ء کے مالیاتی بحران کے بعد بہت سے کھاتہ دار جن میں کچھ بڑے کھاتے بھی شامل ہیں دیوالیہ ہو گئے تھے۔جس کے باعث بینکوں کے نان پرفارمنگ قرضوں (NPLs) میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہو گیا تھا جس نے بینکوں کے نجی شعبے کو قرضے دینے کی حوصلہ شکنی کی۔2017ء کے دوسرے کوارٹر میں بینکوں نے 449.2 ارب روپے کی سرمایہ کاری کی جس میں سے 425.1 ارب گورنمنٹ پیپرز میں لگائے گئے۔اس سے بینکوں کے رجحان کا اندازلگایا جا سکتا ہے۔یوں بینکنگ سیکٹر کا یہ بلبلہ اپنے منطقی انجام کی طرف رواں دواں ہے۔آنے والے سالوں میں اگر حکومتی بحرانوں کے باعث دوبارہ آنے والی حکومتیں کمرشل بینکوں سے مہنگے قرضے لینے کی طرف جاتی بھی ہیں تو اب ملک کے عمومی معاشی و سیاسی بحرانوں کے تناظر میں اسے آسان اور رسک فری سرمایہ کاری قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جہاں بینکنگ کا بلبلہ اپنے منطقی انت کی طرف بڑھ رہا ہے وہیں سٹاک ایکسچینج کے حالات بھی انتہائی دگرگوں ہیں۔درحقیقت گزشتہ کئی سالوں سے حکومتیں اور انکے معاشی مشیران پاکستان کی تیز ترین سٹاک ایکسچینج کو اپنی کامیاب معاشی پالیسیوں کی دلیل اور ملک کے بہتر مستقبل کی نوید کے طور پر جتاتے رہے ہیں۔یہ بات درست بھی تھی کہ اس سال کے اوائل میں پاکستان کی سٹاک مارکیٹ ایشیا کی سب سے بہترین پرفارمنگ سٹاک مارکیٹ تھی۔بڑے پیمانے پر پیسہ بنایا جا رہا تھا اور ہر طرف جشن کا سماں تھا۔نہ صرف بڑے سرمایہ دار بلکہ درمیانے طبقے کی اوپری پرتوں میں بھی ہر طرف شیئرز کے خریدنے اور بیچنے کی باتیں عام ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن حقیقت میں سٹاک مارکیٹ کبھی بھی معیشت کی اصل طاقت کی درست تصویر کشی نہیں کرتی۔یہ عین ممکن ہے کہ ایک انتہائی مضبوط معیشت کی سٹاک مارکیٹ وقتی مندی کی لپیٹ میں آ جائے اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ ایک انتہائی کمزور معیشت کی سٹاک مارکیٹ لمبے عرصے کے لیے ابھار میں رہے۔بلکہ جب سرمایہ داروں کے پاس سرمایہ کاری کے دیگر میدان معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں تو پھر وہ بڑے پیمانے کی جوے بازی پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔سٹاک مارکیٹ کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کا انحصار حقیقی معیشت کے اتار چڑھاؤ سے زیادہ قیاس آرائیوں اور مبالغہ آمیز افواہوں پر ہوتا ہے

لیکن آخری تجزیے میں حقیقی معیشت جلد یا بدیر انتقامی کاروائی پر اتر آتی ہے۔

پاکستان کی سٹاک مارکیٹ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے اور بڑے پیمانے کی کمائی کے بعد اب مندی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ 2016ء میں پاکستان کی سٹاک مارکیٹ کو دنیا کی پانچویں بہترین سٹاک مارکیٹ کہا جا رہا تھا لیکن اب چیزیں اپنے الٹ میں بدل چکی ہیں۔ اصل میں پاکستانی سٹاک مارکیٹ سے بڑے پیمانے کی توقعات وابستہ کرنا ہی بڑی حماقت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت میں سٹاک مارکیٹ کا پھیلاؤ ہی اتنا نہیں ہے کہ جو ملکی معیشت کے لیے بیساکھی کا کردار ادا کر سکے۔ کل 150000 رجسٹرڈ کمپنیوں میں سے صرف 562 کمپنیاں ہی (Listed) ہیں۔ اس لیے اگر مارکیٹ میں بہت زیادہ لیکویڈیٹی یعنی سرمایہ گردش میں ہوتا بھی ہے تو وہ چند شیئرز کا ہی تعاقب کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سٹاک مارکیٹ کے بڑے جغادری اکثر و بیشتر قانونی رکاوٹوں (Code of Corporate Governance) اور حکومتی پالیسیوں کا رونا روتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت سٹاک مارکیٹ میں کمپنیوں کی لسٹنگ سے زیادہ ڈی لسٹنگ کا رجحان غالب آ چکا ہے۔ 2017ء میں چھ IPOs کی آمد متوقع تھی لیکن حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سپانسرز نے انہیں تعطل میں ڈال دیا ہے۔ 30 اکتوبر 2017ء کے ڈان کے مطابق Listed کمپنیوں کے ایک تہائی کا گردشی شیئر (Share Float) 25 فیصد سے کم ہے۔ 20 کروڑ کی آبادی کے اس ملک میں سے صرف پانچ لاکھ لوگ شیئرز کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ حکومت پر اس ضمن میں شدید تنقید کی جاتی ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر عوامی سرمایہ کاری کے لیے راہ ہموار نہیں کر رہی۔ نام نہاد ماہرین کے خیال میں پبلک اداروں کی نجکاری اس حوالے سے ایک اہم پیشرفت ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے ہی بہت سے اداروں کی نجکاری کی جا چکی ہے مگر اس سے سٹاک مارکیٹ میں عوامی شرکت کیوں نہیں بڑھ پائی۔ اصل وجہ دن بدن پبلک کی بچتوں پر پڑنے والا دباؤ ہے اور زندہ رہنے کی قیمت ہی اتنی زیادہ ہوتی جا رہی ہے کہ لوگ اس قسم کی سرمایہ کاری کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے سٹاک مارکیٹ ملکی معیشت میں اپنے معینہ کردار کی ادائیگی کی اہلیت سے مکمل طور پر قاصر ہی رہے گی۔ اس لیے اب اگر سٹاک مارکیٹ کا بلبلہ پھٹ رہا ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ 2016ء میں منہ میں پانی لانے والے 46 فیصد ریٹرن کے بعد اب غبارے سے ہوا نکل رہی ہے۔ 25 مئی کو KSE میں 53124 پوائنٹ کی ریکارڈ سطح عبور کر لی گئی تھی۔ اور اس سال کے آخر تک سٹاک بروکرز

56000 پوائنٹ تک پہنچنے کا تخمینہ لگا رہے تھے، مگر اچانک ان کی توقعات کے برعکس کوئی 'ناگہانی آفت' آ گئی اور تب سے لے کر اب تک یعنی 30 اکتوبر تک سٹاک مارکیٹ 22 فیصد سکڑ چکی ہے۔ مستقبل میں بھی سٹاک مارکیٹ میں اس طرح کے بلبلے بنتے اور پھٹتے رہیں گے لیکن اس کے بلبوتے پر ملکی معیشت کی سمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی تقریباً گزشتہ ایک سال سے رئیل اسٹیٹ سیکٹر بھی کسی حد تک جمود کا شکار دکھائی دے رہا ہے۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں سے اس شعبے کا ملکی معیشت میں حصہ بڑے پیمانے پر بڑھا ہے اور اس وقت محدود اندازے کے مطابق پاکستان کے رئیل اسٹیٹ سیکٹر کا حجم سات ٹریلین روپے کے لگ بھگ ہے۔ رئیل اسٹیٹ میں اگر کنسٹرکشن کے شعبے کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ ملکی GDP کے دو فیصد کے برابر بنتا ہے۔ سیمنٹ، سٹیل، پینٹ، بھٹہ خشت، بلڈنگ میٹیریل اور دیگر بہت سی صنعتیں اس شعبے پر انحصار کرتی ہیں۔ اس سیکٹر کا بڑا حصہ ابھی تک غیر رسمی معیشت کے تحت آتا ہے لیکن اب چونکہ بیرونی سرمایہ کار بھی اس شعبے میں دلچسپی لے رہے ہیں، اس لیے اس شعبے کو مکمل طور پر باقاعدگی میں لانا ضروری تھا۔ لیکن اس حوالے سے جو اقدامات کیئے گئے ہیں ان میں اس شعبے پر لگائے جانے والے ٹیکس پر اس شعبے کے خیر خواہوں کی طرف سے کڑی تنقید کی گئی ہے۔ اگر سماج کی حقیقی ضرورت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس شعبے میں مستقبل میں بڑے پیمانے کی گنجائش موجود ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت فوری طور پر پاکستان میں ایک کروڑ سے زائد گھروں کی ضرورت ہے اور اس شارٹ فال میں سالانہ تین فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ داری میں کسی شعبے کے پھیلاؤ کا انحصار لوگوں کی ضرورت کی بجائے اس شعبے میں حاصل ہونے والی شرح منافع پر ہوتا ہے۔ اس وقت خود ریاستی ادارے اس شعبے میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کر رہے ہیں، تمام اہم شہروں میں DHA کے پراجیکٹس تعمیر ہو چکے ہیں یا زیرِ تعمیر ہیں اور اس کے بعد یقیناً یہ سلسلہ چھوٹے شہروں تک بھی بڑھے گا۔ پاکستانی ہائیکورٹ کے جج نے گزشتہ برس ایک مقدمے کے دوران طنزیہ ریمارکس دیتے ہوئے کہا تھا کہ انڈیا کو پاکستان سے نہیں بلکہ DHA سے خطرہ ہے کہ کہیں یہ دہلی تک نہ پہنچ جائے۔ ایشیا کی سب سے بڑی رئیل اسٹیٹ مافیا بحریہ ٹاؤن کا مالک ریاض ملک بھی اصل میں انہی کا فرنٹ مین ہے۔ اس حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس شعبے کی ریگولرائزیشن کا مقصد دیگر سرمایہ کاروں کی خود DHA کے ساتھ مسابقت کی صلاحیت کو کم سے کم کرنا بھی ہے۔

اصل میں یہ شعبہ شروع سے ہی بہت غیر مستحکم اور ناقابلِ تخمینہ رہا ہے۔اور چند سالوں کے مختصر عرصے میں یہ بلندی اور پسپائی دونوں کے ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔باقی دنیا میں اس شعبے میں 5 سے 8 فیصد کی شرحِ نمو کو بہت اچھا سمجھا جاتا ہے مگر پاکستان میں اچھے دنوں میں اس شعبے میں ماہانہ 10 فیصد تک کا گروتھ ریٹ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔اس کی بڑی وجہ کالی اور غیر رسمی معیشت کو قرار دیا جاتا ہے۔2014ء تک اس شعبے پر کوئی قانونی قدغن اور ٹیکس نہیں تھا۔اور چونکہ حکومت کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ نہیں تھی کہ یہ سرمایہ کہاں سے آیا ہے اس لیے یہ شعبہ کالے دھن کے لیے سب سے زیادہ پرکشش تھا۔اسی وجہ سے اس شعبے میں بھی ایک بڑا بلبلہ بنا اور مانگ اور رسد کی خلیج دن بدن بڑھتی چلی گئی۔اس کے علاوہ اس شعبے کی تیز ترین بڑھوتری کی ایک وجہ جنوبی ایشیا میں پاکستان کے اندر سب سے زیادہ تیز ترین اربنائزیشن ہے جسکی شرح 53.3 فیصد ہے اور ایک رپورٹ کے مطابق اگر یہ رجحان برقرار رہا جس کے قوی امکانات ہیں تو 2025ء تک پاکستان کی شہری آبادی 95.62 ملین تک پہنچ جائے گی۔ایک رئیل اسٹیٹ مارکیٹنگ کمپنی منہل (Manhill) ایڈورٹائزنگ کے مینیجنگ ڈائریکٹر اخلاق احمد کے مطابق کراچی، لاہور اور اسلام آباد کی رئیل اسٹیٹ اپنی گنجائشوں سے تجاوز کر چکنے کی وجہ سے اب سرمایہ کاروں کا رجحان چھوٹے شہروں کی طرف ہے جن میں بھور بن، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، سرگودھا، ملتان، ٹیکسلا، ڈیرہ غازی خان وغیرہ شامل ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس شعبے کی ترقی کا اہم پہلو طبقاتی رہا ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ آبادی کی قوتِ خرید سے مکانوں کی قیمتیں متصادم ہوتی جا رہی ہیں۔مثال کے طور پر 2010ء سے 2016ء کے دوران جہاں ایک طرف لگژری اپارٹمنٹس کی قیمتوں میں 120 فیصد اضافہ ہوا ہے لیکن چھوٹے مکانوں کی قیمتوں میں صرف 80 فیصد کا اضافہ ہوا جو کم مانگ کی غمازی کرتا ہے۔مگر اب رئیل اسٹیٹ کے عمومی طور پر برے حالات دکھائی دے رہے ہیں۔ سال 2015ء میں رہائشی جائیدادوں یعنی اپارٹمنٹس، مکان اور خالی پلاٹوں کے کاروبار میں سرمایہ کاری میں پانچ سے سات فیصد اضافہ ہوا تھا۔جبکہ کمرشل جائیدادوں یعنی دکانوں، پلازوں، دفاتر اور شوروموں وغیرہ میں سرمایہ کاری میں 15 سے 20 فیصد اضافہ ہوا تھا۔اس مناسبت سے ماہرین مطمئن اور پراعتماد تھے کہ 2016ء میں بھی یہ رجحان برقرار رہے گا۔2015-16ء کے بجٹ میں اس شعبے کو بہت سارے ٹیکسوں میں چھوٹ دی گئی۔بلڈنگ میٹیریل کی صنعت کو 30 جون 2018ء تک ٹیکسوں میں رعایت دی گئی جبکہ کنسٹرکشن مشینری کی درآمدات پر کسٹم ڈیوٹی کو

دس فیصد کم کر دیا گیا۔ان تمام حکومتی اقدامات کے باوجود سال کے آغاز میں ہی رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں کمی کا رجحان دیکھنے میں آ رہا تھا۔اس پر سرمایہ کاروں کی توقعات پر مزید پانی اس وقت پھرا جب جون 17-2016ء کے بجٹ میں پراپرٹی ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا گیا۔تب سے رئیل اسٹیٹ میں شدید مندے کا رجحان غالب ہے۔لیکن جہاں اس شعبے میں ٹیکسوں نے کاروبار میں کمی میں ایک کردار ادا کیا ہے وہیں اس شعبے کی اپنی حدود و قیود بھی ہیں اور کسی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب یہ اپنی حدود کو پہنچ رہا ہے۔اس کی واضح مثال اکنامک سروے آف پاکستان 17-2016ء کی رپورٹ ہے جس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اس سال کنسٹرکشن کے شعبے نے 9.05 فیصد کی شرح سے ترقی کی جو گزشتہ برس 14.6 فیصد کی شرح سے ترقی کر رہا تھا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس شعبے میں برے دنوں کا آغاز ہو چکا ہے۔چھوٹے شہروں یا مضافات میں کراچی یا لاہور جیسے منافع بٹورنا آسان نہیں ہوگا اور بہت جلد ان شہروں کی پراپرٹی کی مارکیٹ اپنی گنجائش کو پہنچ جائے گی۔ان شہروں میں مصنوعی درمیانے طبقے کی معاشی بنیادیں پہلے ہی متزلزل ہیں اور غریب عوام کی اکثریت کے لیے تو یہ شعبہ ویسے ہی کسی اور سیارے پر واقع ہے۔حتیٰ کہ کراچی، لاہور، فیصل آباد اور اسلام آباد جیسے شہروں میں بھی جھونپڑ پٹیاں نظر آتی ہیں جن میں لاکھوں خاندان مقیم ہیں۔یہ شعبہ عمومی معاشی ڈھانچے کے کردار کے پیشِ نظر ان لاکھوں لوگوں کو کبھی بھی معاشی سائیکل میں نہیں لا سکے گا۔عمومی معاشی زوال کے ساتھ پاکستان میں ایک طرف بے گھروں کی تعداد میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوگا تو دوسری طرف کرائے اور خرید و فروخت کے لیے گھروں کی تعداد بھی بڑھے گی۔ہم پہلے ہی امریکہ اور چین جیسے ممالک میں اس مظہر کو انتہائی واہیات شکل میں پنپتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔

خدمات اور زراعت

پاکستانی معیشت کا کل حجم اب 300 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے جس میں سب سے بڑا حصہ یعنی 58 فیصد خدمات کے شعبے پر مشتمل ہے۔اور اس کا یہ حجم مسلسل بڑھتا ہی جا رہا ہے۔25 مئی 2017ء کو وزیرِ خزانہ اسحاق ڈار نے اکنامک سروے آف پاکستان 17-2016ء پیش کیا۔جس کے مطابق ملک کی شرح ترقی 5.28 فیصد قرار پائی جو گزشتہ برس 4.51 فیصد تھی۔جبکہ خدمات کے شعبے کی شرحِ نمو 5.98 فیصد رہی جو گزشتہ برس 5.55 فیصد تھی۔لیکن روزگار پیدا کرنے کے

حوالے سے پاکستانی معیشت کا یہ شعبہ کوئی خاص کردار ادا نہیں کر پا رہا۔ یوں تو عالمی معیشت کا بھی سب سے بڑا شعبہ خدمات کا شعبہ ہی ہے جو کل گلوبل آؤٹ پٹ کے 70 فیصد پر مشتمل ہے لیکن دنیا بھر میں تقریباً ایک تہائی روزگار ہی اس شعبے سے وابستہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے دنیا کی معیشت تیزی سے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے امکانات سے محروم ہوتی جا رہی ہے جبکہ پاکستان میں بھی یہ شعبہ صرف 35 سے 37 فیصد ہی روزگار پیدا کر رہا ہے۔ جبکہ اس شعبے میں کام کرنے والی لیبر فورس کا تقریباً 15 سے 20 فیصد تک سات سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں پر مشتمل ہے۔ جہاں، ہوٹلوں، ورکشاپوں، ٹرانسپورٹ اور اسی طرح کے دیگر شعبوں میں بچوں سے انتہائی کم اجرت پر وحشیانہ طریقے سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ شعبہ ملکی برآمدات میں 5.3 ارب ڈالر کا حصہ ڈالتا ہے اور اس شعبے میں تجارتی خسارہ 2014ء میں 3 ارب ڈالر کے لگ بھگ تھا۔ پاکستان کے محنت کش طبقے کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس شعبے کی ترقی سے ان کے حالات سدھرنے والے نہیں ہیں۔ بینکنگ کے شعبے میں ٹریڈ یونینز پہلے ہی برباد ہو چکی ہیں۔ ٹیلی کمیونیکیشن اور دیگر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں ٹریڈ یونینز کا تصور تک محال ہے۔

زرعی شعبے کا حجم کل GDP کے 19.53 فیصد پر مشتمل ہے جس میں کل لیبر فورس کا 42.3 فیصد کام کرتا ہے۔ گزشتہ برس 2016ء میں اس کی شرحِ نمو 3 فیصد کے لگ بھگ تھی۔ جو کہ گزشتہ برس کی 0.27 فیصد کے مقابلے میں کافی بہتر دکھائی دیتی ہے۔ اسکی سب سے بڑی وجہ کاٹن جیننگ میں گزشتہ برس ہونے والی مکمل تباہی کے بعد کچھ بہتری ہے۔ لیکن زراعت کے شعبہ میں اس نسبتی بہتری پر خوش ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجموعی صورتحال قابلِ رحم اور انتہائی تکلیف دہ ہے۔ پاکستان جو بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا، اسکی زراعت کا آج یہ عالم ہے کہ پاکستان کو خوراک کی تجارت میں بھی تجارتی خسارے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ 13-2012ء اور 14-2013ء میں خوراک میں پاکستان کو بہت زیادہ سرپلس حاصل ہو رہا تھا۔ لیکن اب ملک میں خوراک کے خام مال اور تیار آئیٹمز کی درآمدات کی مانگ میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہو رہا ہے۔ 13-2012ء میں ملک کی خوراک کی برآمدات 4.76 ارب ڈالر تھیں جبکہ اگلے سال یہ 4.62 ارب ڈالر رہیں جبکہ انہی دو سالوں میں درآمدات بالترتیب 4.19 ارب ڈالر اور 4.24 ارب ڈالر رہیں۔ یہ اگرچہ سرپلس تھا مگر اس سرپلس کا حجم بہت کم رہ گیا تھا اور یہ خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ اسی وقت سنجیدگی سے اگر زراعت کی صورتحال کا جائزہ لے کر کوئی مناسب حکمتِ عملی ترتیب دی جاتی تو آج

یہ صورتحال نہ ہوتی۔ ابھی فوری طور پر خوراک کے 200 کے لگ بھگ درآمدی آئیٹمز پر ڈیوٹی بڑھا کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان دو سو اجناس کی درآمد پر پاکستان نے اس برس 2 ارب ڈالر کے لگ بھگ خرچ کیا ہے جو کہ خوراک کی کل درآمدات کا ایک تہائی بنتا ہے۔

یہ حکمران طبقہ صرف اپنی لوٹ مار کی حد تک اس نظام کو چلانے میں سنجیدہ ہے باقی رتی برابر بھی کوئی مثبت یا ترقی پسندانہ رجحان اس حکمران طبقے کی گھٹی میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف خوراک کا تجارتی خسارہ ہے وہیں اس زرعی ملک میں خود لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ گزشتہ برس 12 اکتوبر 2016ء کو ڈان نے ایک رپورٹ شائع کی جس کا عنوان تھا 'پاکستان کو سنجیدہ بھوک کا سامنا' 2016ء گلوبل ہنگر انڈکس کے مطابق پاکستان کی 22 فیصد آبادی غذائی قلت کا شکار ہے۔ اس انڈکس کے 118 ممالک میں پاکستان کا 107 واں نمبر ہے۔ یہ اس ملک کی صورتحال ہے جو دودھ، کماد یعنی گنا اور کھجور پیدا کرنے والا دنیا کا پانچواں، آم، چاول اور کاٹن پیدا کرنے والا دنیا کا چوتھا، چنا پیدا کرنے والا تیسرا، گندم اور پیاز پیدا کرنے والا ساتواں، آڑو اور کنوں، سنگترے، مالٹے پیدا کرنے والا دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے۔ لیکن زرعی زمین سے آبادی کی بھاری تعداد کے بے ملکیت ہو جانے کے باعث اور مٹھی بھر اشرافیہ کے قبضے کی وجہ سے لوگ بھوک سے مرنے اور فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ابھی گزشتہ رمضان میں پیاز اور بعد ازاں عیدالاضحیٰ پر ٹماٹر نایاب ہو گئے تھے۔ جس سے انہی لوٹ مار کرنے والے بھیڑیوں نے خوب منافع بٹورا۔ 2 اکتوبر 2017ء کے ڈان میں 'سبزیوں کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ' کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں غیر رسمی یا غیر دستاویزی معیشت میں گروتھ، رقم کی غیر رسمی منتقلی پر قابو نہ ہونے، سماج کے امیر طبقے، افراطِ زر کی توقعات سے باخبر نہ ہونے اور صارفین کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہ ہونے کو اس قسم کے مصنوعی شارٹ فال کی وجوہات بتایا گیا ہے۔ صارفین کی طرف سے مزاحمت کا مطلب شاید مصنف کو خود بھی معلوم نہیں۔ صارفین جب بنیادی اشیائے خورد و نوش کے حصول کے لیے میدانِ عمل میں اتر آئیں تو وہ ایک انقلاب کا ماحول بنا دیتے ہیں۔ اسی لیے یہ حکمران اپنے پالتو میڈیا کے ذریعے ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ عوام صرف نان ایشوز میں ہی الجھے رہیں۔

اس صورتحال کی ایک اہم وجہ زرعی شعبے کی پیداواریت میں افزائش کا نہ ہونا ہے۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ خوراک کی اجناس کی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو پا رہا بلکہ نسبتاً کمی

ہورہی ہے جس کی وجہ سے بھی اشیائے خوردونوش کی قیمتوں میں ہر سال اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ نیشنل فوڈ سکیورٹی اینڈ ریسرچ کی وزارت کے اعداد وشمار کے مطابق 2010ء سے 2016ء کے مابین ٹماٹر کے علاوہ باقی سبزیوں کی پیداوار 3 ملین ٹن سے 3.3 ملین ٹن کے درمیان ہی رہی، لیکن اس دوران آبادی میں اضافے کی شرح زیادہ تھی۔ اسی طرح پھلوں کی پیداوار جو اس عشرے کے آغاز پر 4.7 ملین ٹن تھی، کم ہوکر 4.2 ملین ٹن رہ گئی ہے۔ مانگ اور رسد میں مسلسل بڑھتے ہوئے اس فرق کا ناگزیر اظہار خوراک کے شعبے میں افراطِ زر کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے معاشرے میں بھوک، غذائی قلت اور دیگر مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجوہات میں سے ایک بہت سی زرعی قابلِ کاشت اراضی کا استعمال میں نہ آنا بھی ہے۔ اگر یہ ساری زمین بے زمین ہاریوں کے حوالے کر دی جائے اور جدید مشینری پر سبسڈی بھی مہیا کی جائے تو چند سالوں میں پاکستان کی خوراک کی تجارت کا سرپلس سینکڑوں گنا بڑھ سکتا ہے۔ لیکن مالکان کی شکل میں موجود جونکیں جو انسانوں کے خون پر پلتی ہیں وہ نہ تو اس نظام کے اندر ایسا کریں گے اور نہ ہی خود زرعی پیداواریت میں اضافے کا سوچیں گے کیونکہ ان کی زیادہ تر دلچسپی اب پراپرٹی، سٹاک ایکسچینج اور دیگر شعبوں کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ مذکورہ بالا رپورٹ میں ہی ڈان لکھتا ہے کہ ''پاکستان میں دولت کے انباروں پر بیٹھے لوگ ہر چھوٹی بڑی چیز میں سرمایہ کاری کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔ وہ قربانی کے جانوروں، لائیوسٹاک، غیر قانونی پراپرٹی اور بڑی اور چھوٹی فصلوں میں بھی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں سبزیوں کے کھیت کٹائی سے پہلے ہی نیلام ہوجاتے ہیں۔ یہ سرمایہ کار جوان اجناس کی آئندہ فصل بھی خرید لیتے ہیں وہ زیادہ منافع بٹورنے کی غرض سے ذخیرہ اندوزی اور مصنوعی قلت جیسے اقدامات کرتے ہیں۔'' بہت سے معزز ماہرین کارپوریٹ فارمنگ کو ان مسائل کا حل قرار دے رہے ہیں، ملکیتی رشتوں کی تبدیلی کے بغیر فارمنگ اور جدید مشینری کے استعمال سے پیداوار تو بڑھائی جاسکتی ہے مگر عوام کی بھاری اکثریت کو مزید بیروزگار کر کے اس پیداوار کی کھپت کے لیے قوتِ خرید بڑھانا ممکن نہیں ہوگا اور یوں پیداوار کے ساتھ ساتھ بھوک بھی بڑھتی جائے گی۔ سی پیک کے منصوبے کے تحت اگر کارپوریٹ فارمنگ کی جاتی ہے تو اس کے بھی یہی نتائج برآمد ہونگے۔

پانی

پانی کی قلت کا مسئلہ بھی زرعی ترقی کے فقدان کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ IMF کا کہنا ہے کہ پاکستان پانی کی کمی کے دباؤ کا شکار دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن چکا ہے جس کی فی کس پانی کی دستیابی 1017 کیوبک میٹر ہے جو 1000 کیوبک میٹر کی قلت کی خطرناک حد کے قریب قریب ہے۔ 2009ء میں یہ 1500 کیوبک میٹر فی کس تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتنی تیزی سے پانی کا مسئلہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ پاکستان پانی استعمال کرنے والا دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے۔ اس کا GDP کے فی یونٹ کیوبک میٹر استعمال دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ماحولیاتی تبدیلیوں نے اس ضمن میں بڑے پیمانے کی غیر یقینی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ایک ہی سال میں ملک کے بڑے حصے میں سیلاب اور پھر قحط سالی کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ زراعت کے لیے اور انسانی استعمال کے لیے پانی نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں سمیت بہت سے مقامی طفیلیے پانی کے کاروبار سے اربوں روپے کما رہے ہیں۔ شہروں میں پانی کی قلت ایک خانہ جنگی کا سا ماحول پیدا کر سکتی ہے۔ اگر یہی صورتحال رہی تو آنے والے دنوں میں پانی بھی تیل کی طرح ہی ملے گا۔ جیسے بہاولپور کے نواحی علاقے میں تیل کا ٹینکر الٹ جانے سے معصوم غریب لوگ اپنی عید کو پرمسرت بنانے کی امید کے جھانسے میں آ کر زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے مستقبل میں پانی کے معاملے پر بالکل اسی طرح کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ حکمرانوں کی جس معاملے پر سب سے کم توجہ ہے وہ یہی پانی کا مسئلہ ہے۔ ریاست کے عدلیہ اور پارلیمان سمیت تمام ادارے دیگر بے شمار قسم کے نان ایشوز پر لاحاصل تکرار میں لگے رہتے ہیں لیکن اس زندگی اور موت کے مسئلے پر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بڑے ڈیموں کے قیام پر تو سیاسی قیادت کا اتفاقِ رائے ممکن نظر نہیں آتا اور چھوٹے ڈیموں پر بھی کسی حکومت نے کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ UNDP کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی بقا کو سب سے بڑا مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی سے نہیں بلکہ پانی کی کمی سے ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2025ء تک ملک مکمل طور پر خشک سالی کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے واپڈا کے سابقہ چیئرمین شمس الملک ایڈووکیٹ کا کہنا تھا کہ پانی کے مسئلے پر پاکستان کی عملاً کوئی پالیسی ہے ہی نہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ پالیسی ساز 'غیر حاضر جاگیردار' (Absentee Landlords) کی طرح کام کرتے ہیں۔ اسی حاکمانہ رویے کے سبب پانی جاگیرداروں کی

ملکیت بن چکا ہے اور غریب اس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ عرفان چوہدری جو اس شعبے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں انکا کہنا ہے کہ ہمارے پاس صرف ایک ماہ کی ضروریات کو پورا کرنے کا پانی سٹور کرنے کی صلاحیت ہے جو انتہائی پریشان کن ہے۔ ابھی کچھ نہ کیا تو پھر بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر وقت پر حکمران طبقہ کچھ نہیں کرے گا، کیونکہ وہ کچھ کرنے کا اہل ہی نہیں، تو پھر جلد یا بدیر محنت کشوں کو ہی کچھ کرنا ہوگا۔

نجکاری اور سماجی ابتری

موجودہ حکومت کو بھی اپنی پیشرو حکومتوں کی طرح معاشی بحران کا ایک ہی حل نظر آتا ہے اور وہ ہے نجکاری۔ اس کے بعد آنے والی حکومتیں بھی اسی پالیسی کو جاری رکھیں گی۔ لیکن اس سال کے شروع میں اس حکومت نے پانچ اہم ادارے بیچنے کا اعلان کیا تھا جن میں پاکستان سٹیل مل کو جون 2017ء تک بیچنے کا منصوبہ تھا جبکہ اسکے ساتھ ساتھ ٹیلیفون انڈسٹریز آف پاکستان (TIP)، انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ بینک اور مری پیٹرولیم کمپنی بھی اس فہرست کا حصہ تھے۔ جلد ہی حکومت نے OGDCL اور PIA کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا تھا مگر حکومت جزوی طور پر ہی اس میں کامیاب ہو سکی ہے۔ کچھ اداروں کے شیئرز فروخت کیے جا سکے ہیں مگر مکمل طور پر PIA اور پاک سٹیل جیسے بڑے اداروں کی نجکاری ممکن نہیں ہو سکی۔ اس میں جہاں حکمران طبقے کے داخلی تضادات نے اہم کردار ادا کیا ہے وہیں ان اداروں میں مزدور تحریکوں کا دباؤ بھی خاص طور پر واپڈا، OGDCL اور PIA میں موجود رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ IMF کے دباؤ میں نجکاری کے مطلوبہ اہداف پورے کرنے کے لیے بعد ازاں ملک کے تین سب سے بڑے ایئرپورٹ یعنی علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ لاہور، جناح ایئرپورٹ کراچی اور بینظیر ایئرپورٹ اسلام آباد کو بیچنے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن آئندہ مالی سال میں چونکہ انتخابات سر پر ہیں اس لیے حکومت کے لیے نجکاری کے احداف حاصل کرنا ممکن دکھائی نہیں دے رہا۔ ایک ٹی وی چینل سے بات کرتے ہوئے وزیرِ اعظم شاہد خاقان عباسی کا کہنا تھا کہ نجکاری ہی PIA کے مسئلے کا واحد حل ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جب بھی حکومت ان اداروں کی نجکاری کی طرف بڑھتی ہے تو اسے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور ہم اس ملک میں مزید عدم استحکام نہیں چاہتے۔

لیکن وزیرِ اعظم صاحب کی رائے کے برعکس 27 اکتوبر 2017ء کے اخبارات نے ایک خبر

شائع کی ہے جس کے مطابق بجلی کمپنیوں سمیت 42 اداروں کی نجکاری کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ان اداروں میں نیشنل بینک، کنونشن سنٹر، سوئی ناردرن، سدرن شامل ہیں جبکہ ریلوے، سٹیل ملز، نیشنل بک فاؤنڈیشن سمیت 28 ادارے طویل المیعاد فہرست کا حصہ ہیں۔رپورٹ کے مطابق مجموعی طور پر 70 اداروں کی فہرست تیار کی گئی ہے جن میں مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان، یوٹیلیٹی سٹورز، ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان، پراسیسنگ زون اتھارٹی، ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان، پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن، سٹیٹ لائف انشورنس، جامشورو پاور جنریشن کمپنی، لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی، ملتان الیکٹرک پاور کمپنی، نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ، گوجرانوالہ الیکٹرک پاور کمپنی، اسلام آباد الیکٹرک سپلائی کمپنی، سول ایوی ایشن اتھارٹی، سمال اینڈ میڈیم انٹر پرائزز، ٹیلی فون انڈسٹریز آف پاکستان، ہیوی الیکٹریکل کمپلیکس، کوئٹہ الیکٹرک سپلائی کمپنی، سنٹرل پاور جنریشن کمپنی، پشاور الیکٹرک سپلائی کمپنی، لاڑکانہ پاور جنریشن کمپنی، ناردرن پاور جنریشن کمپنی، حیدرآباد الیکٹرک سپلائی کمپنی، سوئی ناردرن گیس پائپ لائن لمیٹڈ، کراچی پورٹ ٹرسٹ، نیشنل ہائی وے اتھارٹی اور دیگر ادارے اس فہرست میں شامل ہیں۔سیاسی ماحول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اتنے بڑے پیمانے کی نجکاری ناممکن دکھائی دیتی ہے۔لیکن اگر معاشی افراتفری کو ذہن میں رکھا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس حکومت یا آئندہ حکومت کے پاس بیک وقت ان تمام اداروں کی نجکاری کے علاوہ کوئی اور آپشن بچے ہی نہ۔اس صورتحال سے مزدور تحریک کس طرح متاثر ہوگی اس کو ہم کسی اور باب میں زیرِ بحث لائیں گے لیکن پہلے سے موجود بیروزگاروں کی فوج میں بہت بڑا اضافہ ہوگا۔پہلے ہی بیروزگاری سے تنگ آ کر خود کشیاں معمول کی بات بنتی چلی جا رہی ہے۔30 اکتوبر کے پاکستان ٹوڈے کے مطابق ایک شخص نے سرگودھا میں اپنی بیوی کو مار کر خودکشی کر لی، 7 اکتوبر کو کراچی میں ایک خاتون نے زندگی کو الوداع کہتے ہوئے اپنی جان لے لی، جنوبی پنجاب کے علاقے لیہ میں 5 ستمبر کو ایک شخص نے اپنی تین بیٹیوں کو نہر میں دھکا دے کر خود بھی کود پڑا۔ابھی حال ہی میں ایک 24 سالہ انجینئر نے بیروزگاری سے تنگ آ کر زندگی کا خاتمہ کر لیا۔آئے روز کے اخبارات اس طرح کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔2012ء کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں سالانہ 7000 لوگ خودکشی کرتے تھے۔اب اس میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ظاہر ہے کہ سارا سماج اجتماعی خودکشی تو نہیں کر سکتا۔مزاحمت کا راستہ بھی انہی وحشتوں کے جمگھٹے سے ہی برآمد ہوگا۔

صحت

مذکورہ بالا تمام اداروں کے ساتھ ساتھ صحت کے شعبے کی بھی بڑے پیمانے پر نجکاری کی جا رہی ہے۔ 2010ء میں 18 ویں ترمیم کے بعد صحت کا شعبہ صوبوں کے حوالے کیا جا چکا ہے۔ اسے اس وقت آئینی ماہرین، قانون دان اور سیاسی نقاد ایک اہم پیشرفت قرار دے رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تمام صوبوں میں مختلف پارٹیوں کی حکومت ہے، جو بظاہر ایک دوسرے کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ لیکن تمام پارٹیوں کی حکومتی پالیسیوں میں خوردبینی تضاد بھی نہیں۔ سب نجکاری کی مقدس پالیسی پر گامزن ہیں اور صوبوں کے پاس جو ہے وہ اسے ہی پرائیویٹائز کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے تقریباً تمام صوبوں میں صحت کے شعبے میں بڑے پیمانے کی نجکاری کی جا رہی ہے۔ اس نجکاری کا طریقہ کار یہ ہے کہ یکدم تمام ہسپتالوں اور اداروں کی نجکاری کرنے کی بجائے ایک ایک ادارے کو یا چند اداروں کو بیک وقت نیلام کیا جا رہا ہے یا این جی اوز وغیرہ کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ یہ پالیسی محض بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں بلکہ دیہات اور قصبوں کے بنیادی صحت کے مراکز اور تحصیل اور ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال تک بیچنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے بلکہ اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ اس سے ایک طرف تو ان اداروں میں ڈاؤن سائزنگ اور رائٹ سائزنگ کی وجہ سے ان اداروں کے محنت کشوں کو روزگار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے مگر اس کا ایک اس سے بھی دردناک پہلو یہ ہے کہ ابھی جو غریب خود بیمار ہونے کی صورت میں، یا اپنے بچوں اور بزرگوں کا علاج کرانے کے لیے مولویوں اور جاہل عاملوں کے پاس جانے کی بجائے اکا دکا دس روپے کی پرچی پر اپنا چیک اپ کروا کر بخار، نزلے یا سر درد وغیرہ کی ادویہ مفت حاصل کر لیتے ہیں، وہ اس سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق معاملہ ہی غفلت کی نظر ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے پانی جیسے حساس مسئلے پر حکمران طبقے کی روش کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اس سے کچھ ملتی جلتی صورتحال ہی پاکستان میں صحت کے شعبے کی ہے۔ حتیٰ کہ سیاسی پارٹیوں کی بڑی بڑی نام نہاد انقلابی قیادتوں کی گھنٹوں طویل تقریروں میں بھی صحت جیسے اہم مسئلے پر ایک لفظ بھی سننے میں نہیں ملتا۔ میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا بھی اسے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ تھر میں غذائی قلت اور بھوک سے مرتے بچے کبھی کبھی میڈیا کی توجہ حاصل کر پاتے ہیں لیکن پھر وہ خبر کئی ماہ کے لیے کہیں گم ہو جاتی ہے جیسے وہ سلسلہ ختم ہو گیا ہو۔ حالانکہ تھر میں بچوں کی اموات کا سلسلہ تواتر سے کئی سالوں سے جاری و

ساری ہے۔گزشتہ برس 27 جون 2016ء کے ڈان میں سارہ ملکانی نے صحت کے شعبے کی قابلِ رحم حالت کی منظر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان میں نومولود بچوں کی شرحِ اموات ہر 1000 پر 66 ہے۔جبکہ انڈیا میں یہ تعداد ہر ایک ہزار پر 38 اور سری لنکا میں 8 ہے۔ پاکستان میں خواتین کی اوسط عمر (Life Expectancy) 67 سال بتائی جاتی ہے جو کہ بنگلہ دیش میں 73 اور تھائی لینڈ میں 78 ہے۔زچگی کے دوران شرحِ اموات ہر ایک لاکھ میں 170 ہے جو کہ سری لنکا میں 30 اور تھائی لینڈ میں 20 ہے۔ پاکستانی ریاست کی اس اہم شعبے سے لاتعلقی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ پاکستان میں شعبہ صحت پر ہونے والے سرکاری اخراجات ملک کے GDP کا صرف 0.9 فیصد بنتے ہیں۔ دنیا کے صرف دو ملک ایسے ہیں جو اس شعبے پر اپنے GDP کا پاکستان سے بھی کم حصہ خرچ کرتے ہیں، وہ ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو اور بنگلہ دیش ہیں۔ پاکستان میں صحت پر ہونے والے کل اخراجات کا صرف ایک تہائی پبلک بجٹ سے آتا ہے۔ باقی لوگوں کو نجی شعبے کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔امیر تو فائیو سٹار ہسپتالوں سے ماہر پیشہ ور ڈاکٹروں کی خدمات خرید لیتے ہیں مگر غریبوں کے حصے میں عامل بنگالی، جادوگر، مولوی اور گلی محلے کے عطائی خواتین وحضرات ہی آتے ہیں۔اس سے عوام کی صحت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ویسے تو پاکستان کا شماریات کا شعبہ بھی قابلِ اعتماد حالت میں نہیں جس کی وجہ سے زیادہ تر بیماریوں کی تفاصیل اکٹھی نہیں ہو پاتیں لیکن ڈینگی، ملیریا، ہیضہ، خسرہ اور دیگر بہت سی انتہائی قابل علاج بیماریوں سے اموات معمول کی بات ہے۔ پینے کا صاف پانی آبادی کے تین چوتھائی حصے کو دستیاب نہ ہونے کے باعث بہت سی بیماریاں لاحق ہیں۔ ماؤں کی اکثریت کو زنک اور آئرن وغیرہ کی کمی کا سامنا ہے۔ اس پوری نسل کے قد اپنی گزشتہ نسل کے قد سے کم ہیں۔ بچوں میں دماغ سمیت دیگر جسمانی اعضا کی گروتھ تعطل زدہ ہے۔ ابھی حال ہی میں انکشاف ہوا ہے کہ ہر چوتھا پاکستانی یعنی 26 فیصد لوگ ذیابیطس یعنی شوگر جیسی جان لیوا بیماری میں مبتلا ہیں جسے خاموش قاتل بھی کہا جاتا ہے۔ سروے کے اندر ہی بہت سے لوگوں کو پتہ چلا کہ ان کو یہ عارضہ ہے ورنہ شاید وہ اپنی موت کی وجہ جانے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ نصف سے زیادہ آبادی ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ اور ڈپریشن کی وجوہات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں، بجلی کا نہ آنا مگر بل کا آنا، آلودگی، شور، بچوں کی فیسیں، بزرگوں کی ادویات اور مکان کے کرائے اور ان سب کے متوازی آمدن میں مستقل اور مسلسل کمی ڈپریشن کا بہترین نسخہ ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کھلے عام موت بانٹنے والا سفاک قاتل ہے۔

تعلیم

چھ اگست 2017ء کے ایکسپریس ٹریبیون میں سلمان علی کی سٹوری 'پاکستان کا تعلیمی بحران، ایک حقیقی داستان' کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں انکشاف کیا گیا ہے دنیا بھر کے 67 ملین بچے سکول ہی نہیں جا پاتے۔ EFA ڈیولپمنٹ انڈیکس کے مطابق پاکستان کی شرحِ نمو اگرچہ گزشتہ تین چار سالوں سے اوسطاً 4.5 فیصد رہی ہے مگر پاکستان کے تعلیم پر اخراجات کی شرحِ نمو 2.5 فیصد سے کم ہے اور اس ضمن میں پاکستان 113 ممالک میں سے 106 ویں نمبر پر ہے۔ اگرچہ آئین پاکستان کی رو سے پانچ سے سولہ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم مفت اور لازمی ہے مگر ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی رپورٹ نے انکشاف کیا ہے کہ 2016ء میں تعلیم کے شعبے کے بہت ہی مختصر سے حصے کی کارکردگی میں بہتری آئی ہے جبکہ زیادہ تر حصہ مزید بربادی کی طرف گیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سکول سے باہر بچوں کی تعداد 25 ملین سے کم ہو کر 24 ملین ہوگئی ہے لیکن بالغان میں شرحِ خواندگی 58 فیصد سے کم ہو کر 56.4 فیصد ہوگئی ہے۔ سیکھنے کی صلاحیت کی آؤٹ کم میں معتدل سی بہتری دیکھنے میں آئی ہے جو 2015ء میں 52.33 فیصد سے بڑھ کر 54.7 فیصد ہوگئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق زیادہ تر سکول بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ اوپر سے سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ نہ صرف وفاق بلکہ دو صوبوں یعنی پنجاب اور بلوچستان کی حکومتوں نے رواں مالی سال کے بجٹ سے تعلیم پر اخراجات بڑھانے کی بجائے کم کر دیئے ہیں جو پہلے ہی افسوسناک حد تک کم تھے۔ گزشتہ برس ستمبر میں اقوامِ متحدہ نے اپنی 2016ء کی گلوبل ایجوکیشن مانیٹرنگ رپورٹ جاری کی جس کی روشنی میں پاکستان اپنی پرائمری تعلیم میں 50 سے زیادہ سال دنیا سے پیچھے ہے اور سیکنڈری ایجوکیشن میں 60 سے زیادہ سال پسماندہ ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ملک کو اس قابل ہونے میں کہ اس کا ہر بچہ سکول جا سکے مزید ایک صدی درکار ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس نظام کے تحت مزید ایک تو کیا بیسیوں صدیاں بھی لگا دی جائیں تو یہ نظام بچوں کو تعلیم دینے کی بجائے جہالت کے پاتال میں ہی دھکیل سکتا ہے۔

مذکورہ بالا رپورٹ کے مطابق پاکستان کے سکول سے باہر بچوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ قطعی (Absolute) ہے۔ 5.6 ملین پرائمری سکول جانے والی عمر کے بچے اور 5.5 ملین سیکنڈری سکول جانے والی عمر کے بچے جو کہ لوئر سیکنڈری سکول جانے والی عمر کے بچوں کا 48 فیصد بنتا ہے، اور 10.4 ملین اپر سیکنڈری سکول جانے والی عمر کے لڑکے لڑکیاں سکول نہیں جا

پاتے۔HRCP کی رپورٹ کے مطابق بلوچستان میں 2016ء میں 15000 اساتذہ کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں تھا جبکہ صوبے میں 900 ''گھوسٹ'' یعنی جعلی سکول تھے جن میں تین لاکھ طلبہ کی جعلی رجسٹریشن کی گئی تھی۔ایک اور رپورٹ کے مطابق پاکستان سکول سے باہر بچوں کی تعداد میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔صرف نائیجیریا اس میدان میں پاکستان سے آگے ہے۔ولسن سنٹر کے جمع کیے گئے اعداد و شمار کا کہنا ہے کہ سکولوں سے اساتذہ کی غیر حاضری میں کچھ کمی آئی ہے جو صوبہ پنجاب میں گزشتہ پانچ سالوں میں 20 فیصد سے کم ہو کر 6 فیصد ہو گئی ہے۔صوبہ خیبر پختونخواہ جہاں پر تحریکِ انصاف کی حکومت ہے جو تعلیم کے بڑے چیمپئین بنتے ہیں، وہاں بھی HRCP کی رپورٹ کے مطابق 28000 سکول بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ خیبر پختونخواہ انڈیپنڈنٹ مانیٹرنگ یونٹ نے اپنی مئی 2016ء کی رپورٹ میں کہا ہے کہ 26 فیصد سرکاری سکولوں میں صاف پانی کی سہولت میسر نہیں ہے، صوبے میں سکیورٹی اور امنِ عامہ کی تشویشناک صورتحال کے باوجود دس فیصد سکولوں کی چاردیواری ہی نہیں ہے، 11 فیصد سکول ٹوائلٹ سے محروم ہیں اور 34 فیصد بجلی کی سہولت بلکہ ضرورت سے محروم ہیں۔

اکیڈمی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ مینجمنٹ (AEPAM) جو کہ ایک وفاقی حکومت کا ادارہ ہے کی رپورٹ کا کہنا یہ ہے کہ بلوچستان صوبے میں 1.8 ملین بچے سکول جانے سے قاصر ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بلوچستان میں 13279 سرکاری سکول ہیں ان میں سے 84 فیصد پرائمری اور صرف 16 فیصد مڈل یا ہائی سکول ہیں۔تقریباً 54 فیصد پرائمری سکولوں میں صرف ایک ہی ٹیچر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ بلوچستان میں 26 فیصد سرکاری سکولوں میں صرف ایک کمرہ جماعت ہے۔83 فیصد سرکاری سکولوں کی عمارتوں کی صورتحال غیر تسلی بخش ہے۔ پاکستان کا اعلیٰ تعلیم کا شعبہ اس سے بھی زیادہ دگرگوں حالت میں ہے۔ propakistan.pk کی ایک رپورٹ نے انکشاف کیا ہے کہ وزارتِ خزانہ نے 2016-17ء کے بجٹ میں ہائیر ایجوکیشن کے لیئے تفویض کی گئی رقم روک رکھی ہے۔تمام یونیورسٹیوں کے ڈویلپمنٹ فنڈز میں 60 فیصد سے زائد کی کٹوتیاں کی گئی ہیں۔ہائر ایجوکیشن کمیشن کے لیے 21.48 ارب روپے تفویض کیے گئے تھے لیکن سارے سال میں صرف 8.42 ارب روپے جاری کیے گئے ہیں۔کٹوتی کی گئی رقم کو حکومت نے ٹرانسپورٹ کے دیگر منصوبوں کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ٹھیکیدار یونیورسٹی وائس چانسلروں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں تا کہ یونیورسٹیوں میں

زیرِ تعمیر منصوبوں کو مکمل کیا جا سکے۔ ظاہر ہے موجودہ حکومت کے دور میں گرین بسوں، میٹرو بسوں، ٹرینوں، سڑکوں وغیرہ کے بہت سے پراجیکٹس شروع کیے گئے ہیں جن کے ٹھیکوں اور کام کی نگرانی وغیرہ میں بڑے پیمانے کی خرد برد کرنا ان حکمرانوں اور انکے لاڈلوں کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اس لیے شعبہ تعلیم جیسے حساس ادارے کا بجٹ چپکے سے غبن کر لیا گیا اور کسی نے اس کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ ظاہر ہے یونیورسٹیاں اتنے بڑے پیمانے کے بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لیے فیسیں بڑھانے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔

یہ 2004ء کے بعد HEC کو تفویض کردہ سب سے کم بجٹ ہے۔ درحقیقت HEC کا ادارہ عملاً انحطاط پذیر ہونے کے دہانے پر ہے۔ HEC کو فنڈز کی عدم دستیابی کے باعث بہت سے اہم منصوبے ختم کرنے پڑے ہیں۔ جن میں سب سے اہم بیرونِ ملک مختلف یونیورسٹیوں میں فیکلٹی ممبران کو مزید تعلیم و تربیت کے لیے بھیجنے کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ 2008ء تک HEC سالانہ ایک ہزار طالبِ علموں کو وظائف دے کر دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں بھیجا کرتی تھی۔ ادارے کا حدف یہ تھا کہ پی ایچ ڈی اساتذہ اور طلبا کی تعداد کی شرح کو 1:130 سے کم کر کے 1:20 تک لایا جائے گا مگر یہ پراجیکٹ انحطاط پذیر ہو چکا ہے چونکہ گزشتہ برس صرف 250 طلبہ ہی سکالرشپ پر باہر جا پائے ہیں۔ دوسری طرف وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے 50 نئی یونیورسٹیوں کی تعمیر کا اعلان بھی کر دیا ہے مگر مذکورہ بالا صورتحال میں HEC ان تمام نئے اداروں کو معیاری اور ماہر اساتذہ کی فراہمی کے قابل ہی نہیں۔ دراصل یہ سب ادارے ملک میں تعلیم کے فروغ کے لیے نہیں بلکہ اپنی حمایت حاصل کرنے کے لیے بنائے جا رہے ہیں تا کہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ فلاں لیڈر یا فلاں پارٹی تعلیم کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔ حالانکہ ان تمام یونیورسٹیوں کی ایڈمنسٹریشن میں ان لیڈروں کے نان پروفیشنل رشتہ دار اور فیکلٹی میں بھی ایسے ہی سیاسی ٹھیکیدار براجمان ہو جائیں گے جیسے ہم نے عبدالولی خان یونیورسٹی مردان میں ANP کے بدمعاشوں کو لوٹ مار کرتے ہوئے دیکھا جنہوں نے یونیورسٹی کو کاروباری مرکز میں بدل دیا تھا اور وہاں تعلیم کے معیار کا اندازہ مشعال خان کے قتل میں اتنی تعداد میں طلبہ کے ملوث ہونے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان اعلان کردہ تعلیمی اداروں کا مستقبل بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔

2003ء سے 2008ء کے دوران پاکستان کی بہت سی یونیورسٹیاں دنیا کی بہترین 500 یونیورسٹیوں کی فہرست میں شامل ہو گئی تھیں جن میں ابھی گراوٹ آ چکی ہے۔ NUST دنیا

میں 376 ویں نمبر پر تھی لیکن اب اس کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں۔ نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور اکیلے ادارے کا بجٹ پاکستان کی کئی سرکاری یونیورسٹیوں کے کل مجموعی بجٹ سے بھی تین گنا زیادہ ہے۔ آئندہ حکومتیں بھی موجودہ حکومت کی روش کو جاری رکھتے ہوئے زیادہ تر تعلیمی اداروں کی نجکاری کرنے کی طرف بڑھیں گی۔ تعلیم پر آبادی کے 80 فیصد سے زائد عوام کی دسترس کا حق ہی حکمرانوں نے تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا ہے۔ بحران کے دنوں میں زیادہ تر سرمایہ کاروں کو سرمایہ کاری کے لیے محفوظ شعبوں کی ضرورت ہوتی ہے جہاں انکے سرمائے کے ڈوبنے کے امکانات کم سے کم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے تعلیم اور صحت کے شعبوں میں گزشتہ پانچ سے دس سالوں میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی گئی ہے اور یہ سرمایہ کار پاکستان کے تاریخی تعلیمی اداروں کو بھی بھوکے گدھوں کی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پہلے ہی ہر شاہراہ اور کالونی میں کئی کئی پرائیویٹ تعلیمی ادارے نظر آتے ہیں جہاں پر علم کا دھندا قانون کی سرپرستی میں کھلے عام کیا جا رہا ہے۔ آنے والی نسلوں کا اس نظام اور ان حکمرانوں کے زیرِ سایہ کوئی مستقبل نہیں ہے۔

خواتین

معیشت کی اس تباہ کن صورتحال سے سب سے زیادہ عورتیں متاثر ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں ویسے ہی خواتین معاشی کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور نفسیاتی جبر کا شکار ہوتی ہیں۔ سارا سماجی ڈھانچہ اس حد تک گل سڑ چلا ہے کہ انسان جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ایسے میں ایک پدرسری معاشرے میں ناگزیر طور پر عورت پر جبر اور اسکی محرومی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر گھر میں کھانے کو کم ہے تو بچے کو بچی کا حصہ بھی کھلا دو کیونکہ اس کا طاقتور ہونا ضروری ہے تاکہ وہ جوان ہو کر سارے خاندان کا بوجھ اٹھانے والا بیل بن سکے، اگر خاندان کے معاشی حالات کمزور ہیں اور دو میں سے صرف ایک کی ہی تعلیم کا خرچہ برداشت کیا جا سکتا ہے تو پھر ظاہر ہے بچی کو گھر ہی بیٹھنا ہوگا کیونکہ مروجہ سماجی ڈھانچے میں عورت انسان کم اور ایک شے زیادہ ہے جس کا اصل مقام چار دیواری کے اندر ہی ہے جہاں وہ اغیار سے محفوظ رہ سکے۔

لیکن اب معاشی زبوں حالی کے باعث وہ دن ماضی ہو گئے جب صرف مرد کماتا تھا اور عورت امورِ خانہ داری سرانجام دیتی تھی۔ اب سانسوں کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے نچلے طبقے کی خواتین کو بھی سرمائے کا ایندھن بننا پڑتا ہے تب جا کر گھر کا چولہا گرم ہوتا ہے۔ مگر محنت مزدوری کے ساتھ

ساتھ گھر کے کاموں سے بھی کب آزادی ملتی ہے۔ صفائی ستھرائی، کپڑے برتن دھونا، بچوں کی نگہداشت، کھانا بنانا وغیرہ یہ سب کام بھی عموماً خواتین کو ہی سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ دکھ بھری روداد یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اپنے بھائی، باپ یا پھر خاوند اور اس کے خاندان والوں کی ڈانٹ ڈپٹ، اور بصد اوقات مار اور دھتکار بھی برداشت کرنا اور اس پر چپ رہنا اسکی اخلاقی ذمہ داری ہوتا ہے۔ آخر میں بسا اوقات اپنے ہی شریکِ حیات کے ہاتھوں جنسی تشدد کو برداشت کرنا بھی ایک معمول کی بات ہے جسے سماج میں قانونی، اخلاقی اور سماجی سند حاصل ہے۔ غرضیکہ پاکستان میں خواتین کی اکثریت یعنی غریب اور محنت کش طبقے کی خواتین غیر انسانی ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

17 مارچ 2017ء کے دی نیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستان صنفی ترقی کے انڈیکس میں 137 ممالک میں 106 ویں نمبر پر ہے۔ اور صنفی خود مختاری کی پیائش (Gender Empowerment Meaurement Index) میں 75 میں سے 66 ویں نمبر پر ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ قبائلی اور نیم جاگیردارانہ دیہی علاقوں میں جہاں قتل وغیرہ کی انتقامی کاروائیوں میں عورتوں کو ونی کرنا معمول کی بات ہوتا ہے، وہاں ایسے واقعات کے تدارک کی بجائے ان واقعات کو سرانجام دینے والے یا ان واقعات کے احکامات صادر کرنے والے مقامی جرگوں کو پاکستان کی نام نہاد مقننہ نے قانونی اور آئینی حیثیت دے دی ہے۔ بہت سے غریب والدین اپنی نابالغ کم سن بچیوں کو بوڑھے دولتمندوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں اور اسے سماجی طور پر برا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اور اس طرح کے واقعات رپورٹ بھی کم کیے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ غیرت کے نام پر قتل، زنا بالجبر، جلانے، تیزاب ڈالنے اور جہیز کے نہ ملنے یا کم ملنے پر ذلیل ورسوا کرنے جیسے واقعات بہت زیادہ کامن ہیں۔ پاکستان نومولود بچیوں کی بقا، باخیریت زچگی، خواتین میں خواندگی اور روزگار کی شرح میں دنیا میں سب سے آخری نمبروں میں ہے۔ پنجاب میں خواتین کا روزگار میں کوٹہ 15 فیصد ہے لیکن سندھ میں یہ 5 فیصد ہی ہے۔ 16 جون 2011ء کے ٹریبیون کی رپورٹ میں پاکستان کو خواتین کے حوالے سے دنیا کا تیسرا گھناؤنا ترین ملک قرار دیا گیا ہے۔

ابھی حال ہی میں سندھ یونیورسٹی جامشورو میں طالبات کے جنسی ہراساں کیے جانے کا سکینڈل سامنے آیا ہے جس میں ایک آدھ ٹیچر نہیں بلکہ ایک پورے ڈیپارٹمنٹ اور بہت سے ٹیچرز کے ملوث ہونے کے انکشافات ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھی اطلاعات

اور شکایات موصول ہونے کے باوجود مجرمانہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔لیکن یہ واقعات صرف ایک یونیورسٹی میں نہیں بلکہ،انکا محض انکشاف صرف ایک ادارے میں ہوا ہے باقی تقریباً تمام ہی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ معمول بن چکا ہے۔ایسے ہی کام کی جگہوں، دفاتر اور بالخصوص فیکٹریوں میں جنسی تشدد کے واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر مقدر کی ماری یہ غریب خواتین اس لیئے یہ سب جبر برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں کہ شکایت کرنے پر انکو جاب سے فارغ کر دیا جائے گا۔لیکن اس تمام جبر اور ظلم کے ساتھ ساتھ اسی ملک میں امیر خواتین پر تعیش زندگی گزارتی ہیں۔ اپنے گھروں میں کام کرنے والے معصوموں پر وحشیانہ تشدد کر کے تسکین حاصل کرتی ہیں جن میں اکثریت عام طور پر بچیوں کی ہی ہوتی ہے۔گزشتہ دو سالوں میں ان شریف زادیوں کے اس طرح کے بہت سارے کارنامے منظرِ عام پر لائے جا چکے ہیں۔سول سوسائٹی کی شوخ اور چنچل فیمینسٹ خواتین جو مرد کے خلاف نفرت کی تعلیم و ترویج پر ہی اکتفا کیے رکھتی ہیں انہی بڑے سرمایہ داروں اور مالکان کے بنائے ہوئے ٹرسٹوں، این جی اوز اور دیگر اداروں میں خدمات سرانجام دے رہی ہوتی ہیں جن کی اپنی فیکٹریوں میں عورتوں کے ساتھ جنسی سے لے کر معاشی تک ہر طرح جبر روا رکھا جا رہا ہوتا ہے۔ہم مارکس وادی عورت پر ہونے والے ہر طرح کے ظلم کی نہ صرف شدید مذمت کرتے ہیں بلکہ اس کے خلاف جدوجہد کرنے کو انقلابی کمٹمنٹ کی شرطِ اولیں سمجھتے ہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ عورت پر بھی مرد کی طرح جبر کی بنیادی شکل معاشی اور طبقاتی ہے۔ایک غریب عورت کی زندگی ایک امیر عورت کی نسبت ایک غریب مرد سے زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔اس لیے اس کے دکھ، خوشیاں، جدوجہد اور مفادات بھی اسی کے ساتھ سانجھے ہو سکتے ہیں نہ کہ اس ظالم طبقے کی عورت کے ساتھ جو کبھی ایک غریب عورت کے محسوسات کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ملا اور لبرل سب چونکہ ملکیت کے نظام کے ہی نمائندے ہیں اس لیئے عورتوں کو انسانوں کی جگہ اشیا ہی سمجھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک انکو چھپا کر قید میں رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے اسے سجا کر اسکی تشہیر کر کے اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان جیسے پسماندہ معاشرے میں بھی محنت کش اور غریب طبقے کی خواتین میں اس ملکیت کے ظالمانہ نظام کے خلاف نفرت ایک لاوے کی طرح پک رہی ہے جو بغاوت کا روپ دھار کر کسی بھی طلبہ یا مزدور تحریک میں نہ صرف جان ڈال سکتی ہے بلکہ کسی بھی بڑی انقلابی تحریک کا آغاز بھی کر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی ٹرانسپورٹیشن، سینی ٹیشن اور رہائش جیسے بہت سے سماجی شعبے ہیں جن کے

حالات کوئی زیادہ مختلف نہیں ہیں۔لوڈ شیڈنگ، امن وامان اور ماحولیاتی آلودگی وغیرہ کے بے شمار مسائل ہیں جو اس سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ ہیں اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی حل ہو سکتے ہیں۔اس نام نہاد مملکتِ خداداد میں اس نظام میں رہتے ہوئے کسی قسم کی ہلکی یا چھوٹی سی بھی اصلاح کی گنجائش ناپید ہوتی جا رہی ہے۔دوسری طرف جہاں یہ دوزخ سے بھی بدتر حالاتِ زندگی عوام الناس کو درپیش ہیں وہیں بے شمار معدنی دولت اور قدرتی وسائل بھی ہیں۔ابھی حال ہی میں سندھ کے کچھ علاقوں میں نئے گیس فیلڈز دریافت ہوئے ہیں۔ پہلے ہی بلوچستان میں بے پناہ گیس، سونا، یورینیم، تانبا، کوئلہ اور دیگر بہت سے معدنی وسائل موجود ہیں، اسی طرح پنجاب اور سندھ میں زرخیز زمینوں کی کمی نہیں جہاں بے شمار اناج اگایا جا سکتا ہے۔لیکن ان تمام وسائل اور ممکنات کو اسی وقت آبادی کی اکثریت کے معیارِ زندگی میں بہتری کے لیے بروئے کار لایا جا سکے گا جب ان کی ملکیت اجتماعی ہو گی۔نئی نسل کے شعور میں بڑے پیمانے کی معیاری تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔اس نظام اور اس پر براجمان حکمران طبقے کی ثقافتی غلاظت، اخلاقی اوزار، سیاسی لغویات، معاشی فروعی پن اور سماجی لایعنیت عوامی شعور پر تیزی سے آشکار ہو رہی ہیں۔منافعوں کی ہوس پر مبنی یہ غیر عقلی آئینی ڈھانچے، بے مقصدیت کا شکار غیر منطقی دوڑ، آدمیت سے گریز پر مبنی سماجی رشتے نئی نسل کو قابلِ قبول نہیں ہیں۔یہ نسل کچھ غیر معمولی، بے نظیر اور قابلِ تقلید کر گزرنے کی تیاری کر رہی ہے۔

5۔قومی مسئلے کی اہمیت اور پیچیدگی

گزشتہ دنوں بلوچستان کی مسلح جدوجہدِ آزادی کے سب سے نامور سپہ سالار ڈاکٹر اللہ نذر کی بیوی اور بچوں کو چند دیگر رشتہ دار خواتین اور بچوں کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔اس کے بعد نہ صرف بلوچ قوم پرستوں بلکہ عمومی سیاسی حلقوں میں اس حوالے سے ایک بحث چھڑ گئی۔ظاہر ہے کہ اس قسم کی بزدلانہ اور گھٹیا حرکت کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔لیکن تیسرے ہی روز بلوچستان حکومت نے گرفتار کی گئی خواتین کو انتہائی 'عزت اور احترام' کے ساتھ رہا کر دیا اور ساتھ ہی اپنے عالی ظرف اور بلند پایہ اخلاقی اقدار کی شیخی بگھاری۔لیکن ان تین چار روز میں اگرچہ کوئی بہت بڑا سیاسی ردِعمل تو سامنے نہیں آیا مگر سوشل میڈیا پر بہت عرصے کے بعد قومی سوال پر گرما گرم مباحثے دیکھنے میں آئے۔ یہاں دیکھنے اور سوچنے کی ضرورت اس حوالے سے ہے کہ آخر بلوچستان کی گوریلا جنگ کس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور اس کے بلوچستان کی عمومی قومی آزادی کی تحریک پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ آئی ایس آئی یا دیگر سکیورٹی اداروں کو اس طرح کے مایوس کن اقدامات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟ کیونکہ پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ممالک میں اور خاص طور پر بلوچستان جیسے قبائلی روایات کے حامل معاشروں میں ہر کس و ناکس اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ عورت اور چادر چاردیواری کی حرمت ایک حساس نوعیت کا معاملہ ہوتا ہے اور اس قسم کے اقدامات سے رائے عامہ ضرور متاثر ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔اس حوالے سے دیگر تمام سیاسی، معاشی اور نفسیاتی عوامل اور ان کے پسِ پردہ علاقائی صورتحال کے سفارتی اور سٹریٹیجک محرکات کا گہرائی میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ پاکستان ایک قومی ریاست کے طور پر معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ مختلف قومیتوں کے ایک وفاق کی شکل میں اس کی تشکیل مذہب کی قدرِ مشترک کی بنیاد پر سامراجی ایجنڈے کے تحت کی گئی تھی۔اس حوالے سے اپنی تشکیل کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہی پاکستانی ریاست کا دوہرا کردار پنپنا شروع ہو گیا۔ایک طرف تو یہ جنوب ایشیائی خطے میں امریکہ اور مغربی سامراجی قوتوں کی گماشتہ ریاست کا فریضہ ادا کرنے والی دم چھلہ ریاست تھی مگر ساتھ ہی اس کے اپنے خطے میں

مخصوص سامراجی عزائم بھی موجود تھے۔ جس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ اپنے جنم کے کچھ ہی ماہ بعد پاکستان کو کشمیر میں فوجی وغیر فوجی ذرائع سے ہلہ بول کر اس کے ایک مخصوص علاقے پر قبضہ کرنا پڑ گیا۔ اسی طرح بلوچستان میں وہاں کے حکمران طبقات کے ساتھ مشروط الحاق کے معاہدے کیے گئے جن کی روشنی میں طلب کرنے پر پاکستان بلوچستان کو آزاد کرنے کا پابند تھا۔ مگر یہ صرف پاکستانی حکمران طبقات کا ایک سفارتی حربہ تھا تاکہ چند سالوں میں تقسیم کے پیدا کردہ انتشار پر قابو پا کر اور داخلی طور پر ریاستی اداروں کو منظم کرنے تک بلوچستان کو کسی بھی طرح اپنے ساتھ جوڑ لیا جائے۔ اور پھر وہی ہوا کہ جب بلوچ سرداروں اور نوابوں نے اپنی راجدھانی واپس طلب کی تو ریاست نے اپنے خونی پنجے بلوچستان پر مسلط کر دیئے۔ اس طرح بلوچستان میں بھی پاکستانی ریاست نے قومی جبر کے ذریعے ریاست قلات اور اس کے ملحقہ علاقوں پر فوج کشی کی۔ تب سے لے کر اب تک نہ صرف کشمیر اور بلوچستان بلکہ بنگال، سندھ اور خیبر پختونخواہ میں بھی پاکستانی ریاست عوام کے دل جیتنے میں بری طرح ناکام رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان خطوں کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کے ذریعے اپنے سامراجی ایجنڈے کو نام نہاد ریاست کی حدود سے باہر پھیلاتے ہوئے افغانستان میں بھی اپنا اثر ورسوخ بنانے اور قائم رکھنے کی حکمتِ عملی پر کارفرما ہے۔ اسی لوٹ مار کے خلاف مختلف وقتوں میں تمام محکوم قومیتوں کی چھوٹی بڑی مختلف آزادی کی تحریکیں اور بغاوتیں موجود رہی ہیں۔ جن میں سے ایک بغاوت کے باعث 71ء میں ریاست کو عبرتناک شکست کے بعد اپنے نصف جسم یعنی بنگال سے ہاتھ دھونے پڑے۔ لیکن وہاں سے کوئی عبرت حاصل کرنے کی بجائے ریاست نے اس شکست سے سنبھلنے کے فوری بعد زیادہ وحشت ناک انداز میں باقی ماندہ مظلوم قومیتوں پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کی ٹھان لی اور فوراً ہی بلوچستان میں جاری آزادی کی تحریک کو ختم کرنے کے لیے وہاں فوج کشی کر کے تحریک کو خون سے نہلا دیا گیا۔

جہاں ایک طرف ریاست ان محکوم قومیتوں کا مسلسل معاشی بلادکار کرتی رہی ہے وہیں یہ اسی عرصے میں کہیں بھی کوئی جدید انفراسٹرکچر تعمیر نہ کر سکی بلکہ ان علاقوں کے باشندوں کا معیارِ زندگی بلند ہونے کی بجائے مسلسل گرتا چلا گیا۔ تعلیم، علاج، روزگار جیسی بنیادی ضروریات سے یہ علاقے آج بھی محروم ہیں۔ حتیٰ کہ پینے کا پانی بھی دستیاب نہیں۔ لیکن اس مسئلے کو محض اخلاقی یا رومانوی بنیادوں پر نہیں سمجھا جا سکتا جیسا کہ بہت سے سیاسی رجحانات کا وطیرہ ہے۔ اس ظلم اور لوٹ مار کی بنیادوں کو ریاست پر براجمان حکمران طبقے کے کچھ افراد کے ذاتی کردار یا ریاستی اداروں کی

نمائندگی کرنے والے لوگوں کے افعال کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ریاست پر کچھ شریف النفس خواتین وحضرات براجمان ہو جائیں تو یہ ظلم اور بربریت ختم ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی سوچ سے ان ریاستی اداروں اور حکمران طبقات کی طرف فریادی یا خوشامدی طرزِ تعلق جنم لیتا ہے اور اس ریاستی مشینری میں اصلاح کی خواہش اور نفسیات غالب آجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے مہان قوم پرست بھی گھوم پھر کر کسی نہ کسی راستے اور وسیلے سے ریاست ہی کے کسی دھڑے کے آلہ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔ اصل میں حقائق اس کے بالکل الٹ ہیں۔ ریاست پر براجمان لوگ نہیں بلکہ خود اس ریاست اور حکمران طبقے کا کردار ہی تاریخی طور پر رجعتی، قاتلانہ اور بہیمانہ ہے۔ یہ حکمران طبقہ تکنیکی اور معاشی اعتبار سے اتنا پسماندہ ہے کہ بے پناہ وسائل کے انبار پر دسترس ہونے کے باوجود بھی یہ کسی بھی قسم کا سوشل یا فزیکل انفراسٹرکچر تعمیر نہیں کر سکا۔ اور ایک سے زیادہ سی پیک بھی مزید آجائیں تو اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ یہ بڑے پیمانے پر انفراسٹرکچر بالخصوص سوشل انفراسٹرکچر تعمیر کر سکے۔ اور جب اس ترقی کی گنجائش نہیں ہے جس کے بل پر محکوم قومیتوں کے دل جیتے جا سکیں اور انہیں ایک پاکستانی تشخص کو محبت اور عقیدت سے اپنانے پر مائل کیا جا سکے تو پھر جبر اور ریاستی طاقت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ اس لیے اس ریاست پر اگر کوئی انتہائی متقی یا برگزیدہ فرد یا جماعت بھی برسرِ اقتدار آجائے تو تب بھی وہ اسی جبر اور ریاستی وحشت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی۔

بلوچستان میں محدود اندازوں کے مطابق اربوں ڈالر مالیت کے معدنی وسائل موجود ہیں جن میں سونا، تانبا، بلیک پرل، تیل، قیمتی پتھر، کوئلہ، کرومائیٹ اور قدرتی گیس وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان میں سیب، خوبانی اور دیگر بہت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جو نہ صرف سارے پاکستان کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے میں استعمال ہوتے ہیں بلکہ ساتھ ہی غذائی برآمدات میں بھی اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اخروٹ، بادام اور چلغوزے سمیت دیگر قیمتی ڈرائی فروٹ کی پیداوار بھی بڑے پیمانے پر بلوچستان میں ہی ہوتی ہے۔ پھر بین الاقوامی تجارت کے نقطہ نگاہ سے گوادر جیسی اہم بندرگاہ بھی یہاں پر موجود ہے۔ اسی طرح دیگر محکوم قومیتوں کے علاقوں میں بھی بے پناہ وسائل موجود ہیں۔

ابھی گزشتہ سال ہی سندھ سے مزید قدرتی وسائل دریافت ہوئے ہیں۔ 18 جولائی 2017ء کے ڈان اخبار کی ایک رپورٹ کے مطابق حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سندھ میں تین

نئے گیس کے ذخائر سے مزید 52 ملین کیوبک فٹ روزانہ گیس حاصل کی جاسکے گی اور مزید یہ کہ پچھلے چار سالوں میں 101 ذخائر دریافت کیے گئے ہیں جن سے مستقبل میں استفادہ کیا جاسکے گا۔ زیادہ تر گیس ٹنڈو محمد خان اور بدین کے اضلاع سے نکالی جارہی ہے۔ وزیرِ پیٹرولیم کا کہنا ہے کہ 101 میں سے 68 ذخائر سے پاکستان کے گیس کے ذخائر میں مجموعی طور پر 5.4 ٹریلین کیوبک فٹ روزانہ کا اضافہ متوقع ہے۔ جبکہ مزید 33 ذخائر کا اندازہ لگانا ابھی باقی ہے۔ وزیر کے مطابق ان 101 ذخائر میں سے 87 سندھ میں، 7 پنجاب اور 7 خیبر پختونخواہ میں ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ میں کوئلہ، پیٹرولیم اور دیگر بہت سی معدنیات بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ خیبر پختونخواہ کے پہاڑ بھی معدنیات سے بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان کی کل معدنی پیداوار کا تقریباً 20 فیصد خیبر پختونخواہ سے آتا ہے جس میں ماربل، سونا، کوئلہ، قیمتی پتھر، کرومائیٹ، گرینائیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ خاص طور پر ماربل کی کل ملکی پیداوار کا 78 فیصد خیبر پختونخواہ میں پیدا ہوتا ہے۔ فاٹا میں بھی کوئلہ، تانبا اور پتھر وغیرہ سے کافی معدنی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

یہ حکمران طبقات اتنی وافر قدرتی دولت سے استفادہ حاصل کرنے کی مالیاتی اور تکنیکی اہلیت سے ہی عاری ہونے کی وجہ سے عالمی سامراجی قوتوں کے رحم وکرم پر ہیں۔ یہ سامراجی بھیڑیئے یہاں بڑے پیمانے کی لوٹ مار کر رہے ہیں اور یہاں کے ریاستی اداروں کے سرغنہ اور حکمران طبقات ان کے ٹھیکوں میں بڑے پیمانے کے کمیشن وصول کرتے ہیں اور ان کمیشنوں پر کتوں کی طرح آپس میں لڑتے ہیں۔ محکوم قومیتوں کے حکمران طبقات کو اس میں سے کم حصہ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس لوٹ مار پر اپنا 'جائز' حق حاصل کرنے کے لیے خودمختاری یا آزادی کے لیے آواز بلند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک ان مظلوم قومیتوں کے عوام کا تعلق ہے تو ان کا تو حال جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ جیسے ابھی گوادر پر جدید بندرگاہ اور شہر تعمیر کیا جا رہا ہے اور کراچی سمیت ملک بھر سے مالدار حضرات گوادر کی رئیل اسٹیٹ میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں مگر وہیں گوادر کی مقامی آبادی پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہی ہے۔ سوئی سے گیس نکالی جارہی ہے مگر سوئی سمیت بلوچستان کے درجن بھر اضلاع آج بھی گیس سے محروم ہیں۔ سندھ میں بھی بیش بہا دولت کے ذخائر والے بدین اور تھر کے لوگوں کا معیارِ زندگی دنیا میں کم ترین سطح پر ہے۔ ماؤں میں آئرن اور زنک کی کمی عام ہے اور غذائی قلت اور بھوک سے ہر سال ہزاروں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ پختونخواہ، جنوبی پنجاب، کشمیر اور گلگت بلتستان کے عوام کا بھی کوئی پرسانِ حال نہیں مگر

ان کے حکمران طبقات ریاست سے کسی نہ کسی شکل میں اپنا حصہ وصول کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے کی معدنی دولت سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے پاکستان اور ان مظلوم قومیتوں کے حکمران طبقات کو سامراجی انحصار سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا جس کے لیے جدید صنعتی انقلاب درکار ہے مگر یہ طفیلیے حکمران اس کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے سامراجی لوٹ مار کے ایک آلے سے زیادہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بیرونی سرمایہ کاری کا ایک قابل ذکر حصہ بھی معدنیات کے شعبے میں آتا ہے جس میں آنے والا ہر ایک ڈالر درجنوں ڈالر ساتھ لے کر جاتا ہے۔ دولت کے یہ انبار اس خطے میں چین، امریکہ اور دیگر سامراجی طاقتوں کی یہاں کی سیاست، صحافت، عدالت اور فوج سمیت دیگر تمام شعبہ جات میں مداخلت کی بڑی وجوہات میں سے ایک ہیں جس سے یہ خطہ مستقل پراکسی جنگوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔

21 جون 2016ء ایکسپریس ٹریبیون کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 40 فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ دیہی آبادی کا 54.6 فیصد جبکہ شہری آبادی کا تقریباً 10 فیصد غربت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ فاٹا میں غربت کی شرح سب سے زیادہ ہے جہاں 73.3 فیصد یعنی ہر چار میں سے تین آدمی غربت میں رہ رہے ہیں۔ بلوچستان میں 71.2 فیصد، خیبر پختونخواہ میں 49.2 فیصد، سندھ میں 43.1 فیصد، گلگت بلتستان میں 43.2 فیصد، پنجاب میں 31 فیصد اور کشمیر میں 25 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے رہنے پر مجبور ہے۔ 5 غریب ترین اضلاع میں سے چار بلوچستان میں واقع ہیں۔ قلعہ عبداللہ غریب ترین ضلع ہے جہاں 97 فیصد آبادی غریب ہے۔ اس کے بعد ہرنائی میں 94.2 فیصد، بارکھان میں 93.6 فیصد، شیرانی 90.6 فیصد اور خیبر پختونخواہ کا ضلع کوہستان جہاں 95.8 فیصد آبادی غریب ہے۔ اگر سندھ کی بات کی جائے تو تھرپارکر میں 87 فیصد، عمرکوٹ میں 84.7 فیصد، ٹنڈو محمد خان 78.4 فیصد اور بدین اور کشمور کی 75 فیصد آبادی غربت میں رہ رہی ہے۔ یہ یاد رہے کہ یہ اعداد و شمار حکومتِ پاکستان کے معیارات کے مطابق ہیں اگر عالمی سٹینڈرڈ کو مدِ نظر رکھا جائے تو پاکستان کی اس سے کہیں زیادہ آبادی خطِ غربت کے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ مذکورہ بالا تمام اعداد و شمار اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ تمام تر قومی استحصال کا خمیازہ آبادی کی وسیع تر پرتوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے اور پنجاب میں بھی ہر چار میں سے ایک آدمی شدید غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں ایک اور مخلوق بھی موجود ہے جو آبادی کی اقلیت ہونے کے باوجود پرتعیش

زندگی گزار رہی ہے۔ اگر صرف پاکستان کے پہلے دس امیر ترین افراد کی دولت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دس افراد اربوں ڈالر کے مالک ہیں۔ ان دس افراد کے اردگرد چند سو گھرانے ایسے ہیں جن کی مراعات کو دیکھ کر شاید عربی شہزادے بھی شرما جائیں جن میں بینکاروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، قبائلی سرداروں کے ساتھ ساتھ فوجی جرنیلوں اور ججوں کے نام بھی آتے ہیں۔ اس حوالے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں شدید ترین قومی استحصال کے ساتھ ساتھ بھیانک ترین طبقاتی جبر بھی موجود ہے۔ یعنی یہ حکمران طبقات اپنی تاریخی نااہلی کے باعث جب معاشرے کو ترقی نہیں دے پاتے تو ایک طرف محکوم قومیتوں کے علاقوں میں موجود وسائل کی بہیمانہ لوٹ مار کرتے ہیں اور دوسری طرف فیکٹریوں، کھیتوں، دفاتر اور خدمات کے شعبے میں کام کرنے والے محنت کشوں کے جسم سے آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے درپے رہتے ہیں۔ ایسے میں اس طبقاتی اور قومی جبر کے خلاف برسرِ پیکار مزاحمتی عناصر کے لیے ضروری ہے کہ وہ جبر اور استحصال کی ان شکلوں کے مابین باہمی تعلق کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھنے کی حکمتِ عملی مرتب کریں۔

ایسے میں یہ بات سو فیصد درست ہے کہ بلوچستان سمیت دیگر محکوم قومیتوں کی لوٹ مار پنجاب کے حکمران طبقات ان قومیتوں کے حکمران طبقات کے ساتھ مل کر کر رہے ہیں اور اگر اس طبقے کی سماجی حیثیت ہی ختم کر دی جائے تو اس لوٹ مار کی معاشی بنیادوں کا ہی خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا صرف اور صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے جس کے لیے رفتہ رفتہ حالات پک کر تیار ہو رہے ہیں اور محنت کش طبقات چھوٹی چھوٹی تحریکوں میں سرگرم ہو کر مستقبل کی بڑی انقلابی جنگ کے لیے اہم اسباق سیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک یہ رجعتی اور استحصالی حکمران طبقہ موجود ہے قوموں کی آزادی کی جدوجہد کو کن خطوط پر استوار ہونا چاہیے۔ ہم مارکس وادی محکوم قوموں کے حقِ خودارادیت کی نہ صرف مکمل حمایت کرتے ہیں بلکہ اس جمہوری جدوجہد میں ان کے شانہ بشانہ شریک ہوتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہم سختی سے حقِ خودارادیت کی حمایت کے اس اصول پر کاربند رہتے ہوئے تمام مظلوم قومیتوں کے محنت کش طبقات کو نظام کی تبدیلی کے لیے طبقاتی جنگ میں بھی منظم کرتے ہیں اور قومی آزادی کی تحریکوں کو محنت کشوں کی تحریکوں کے ساتھ جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام مظلوم قومیتوں میں بھی طبقات موجود ہیں تو آزادی کی تحریک کی قیادت کس طبقے کو کرنی چاہیے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان مظلوم قومیتوں کے حکمران طبقات اس اہل نہیں ہیں کہ وہ کسی

بھی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے اسے آخری فتح تک لے جاسکیں اور آزادی بالفرض حاصل ہو بھی جاتی ہے تو یہ اتنے بڑے پیمانے کی دولت اور وسائل کا قبضہ حاصل کر لینے کے باوجود پاکستان کے موجودہ حکمران طبقات کی طرح ان وسائل کو خود بروئے کار لانے کی بجائے سامراجیوں کی گماشتگی پر ہی مجبور ہوں گے۔ یوں ان سامراجیوں سے ملنے والے کمیشنوں سے ان حکمران طبقات کی عیاشیوں میں تو اضافہ ہوگا مگر عام انسانوں کی زندگیوں میں کوئی بہتری نہیں آئے گی۔ اس لیے آزادی کی تحریک کی قیادت بورژوازی یا قبائلی سرداروں کی بجائے محنت کش طبقات کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

کچھ پیٹی بورژواقوم پرست یہ دلیل دیتے ہیں کہ محکوم قومیتوں کے محنت کش یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ وہ آزادی کی تحریک کی قیادت کر سکیں، اس لیے درمیانے طبقے کو یہ فریضہ سرانجام دینا ہوگا۔ لیکن محنت کش طبقہ تو سماج کو چلانے کی اہلیت رکھنے کی وجہ سے اس کو بند کرنے یعنی ہڑتال اور احتجاجی تحریکوں کے ذریعے ایک تحریک کی قیادت کر سکتا ہے جبکہ درمیانے طبقے کے پاس یہ نامیاتی قوت نہ ہونے کے باعث اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے اور وہ گوریلا جنگ یعنی مسلح جدوجہد کا راستہ ہوتا ہے اور جب ایک دفعہ وہ اس راستے پر چل پڑتے ہیں تو حالات کے رحم وکرم پر ان کا انحصار بڑھتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے اپنی بقا کے لیے وہ مختلف سامراجی طاقتوں کی طرف سے مالی واسلحے کی کمک کی شکل میں ملنے والی امداد کے مرہونِ منت ہو جانے کی وجہ سے پراکسی جنگوں میں آلہ کار کے طور پر استعمال ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے معذرت خواہ درمیانے طبقے کے قوم پرست پھر محنت کشوں سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی اس مہم جوئی میں ان کا ساتھ دیں اور اکا دکا انفرادی کامیابیوں کے علاوہ وہ کبھی بھی محنت کش طبقے کی اکثریت کو اس مہم جوئی میں نہیں گھسیٹ سکتے کیونکہ محنت کش طبقے کا حکمرانوں اور سامراجیوں کے خلاف جدوجہد میں انحصار اپنی محنت کی طاقت پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے محنت کشوں سے مایوس یہ قوم پرست ریاست کے ساتھ ساتھ محنت کش طبقے کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اگر یہ ساتھ دیں تو آزادی کا ثمر شاخ سے ٹوٹ کر ان کی گود میں آ گرے۔ یہی نفرت پھر ان کو محنت کشوں کے قتلِ عام کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ اپنی قومیت کے محنت کشوں کو قتل کرنے سے سماجی پناہ گاہوں کے معدوم ہونے کے خطرات ہوتے ہیں اس لیے یہ ان محنت کشوں کا بھی سارا غصہ دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے تارکینِ وطن محنت کشوں پر نکالنا شروع کر دیتے ہیں اور یوں رفتہ

رفتہ عوام کے قریب آنے کی بجائے ان سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجتاً وہ سماج سے اتنا کٹ جاتے ہیں کہ ان کو اس سماج کو چلانے والا محنت کش طبقہ نظر ہی نہیں آتا اور وہ محنت کش طبقے کے وجود سے ہی منکر ہو جاتے ہیں۔

بہت سے مارکس وادی بھی چونکہ بنیادی طور پر درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے وہ قوم پرستوں کے مذکورہ بالا رویے کے ردِعمل کے طور پر قومی سوال کے وجود سے ہی انکار کر بیٹھتے ہیں جو کہ سیاسی طور پر انتہائی مہلک ردِعمل ہے۔ اس کی وجہ سے ان مارکس وادیوں کے بھی محکوم قوم کے محنت کش طبقے سے کٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ وہ یہ دلیل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ حقِ خودارادیت کا نعرہ ہی ناقابلِ عمل ہے اس لیے اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ یعنی مظلوم قومیتوں کے حکمران طبقات نااہل ہونے کی وجہ سے کسی تحریک کی قیادت کے اہل ہیں ہی نہیں، اس لیے محنت کش طبقہ ہی تحریک کی قیادت کرے گا اور سوشلزم کے نفاذ کے بعد چونکہ قومی جبر کی معاشی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی اس لیے یہ نعرہ غیر مؤثر ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن محنت کش طبقات جہاں اپنے حکمران طبقے سے شدید نفرت کرتے ہیں، وہیں بیرونی قابضین سے بھی بے حد نفرت کرتے ہیں اور وہ ایک ایسی حقیقی آزادی کے خواہشمند ہوتے ہیں جس میں ان کی تقدیروں کے فیصلے کرنے کا حق بھی ان کے پاس ہو۔ اس لیے قومی جبر سے یکسر انکار فرقہ پروری کی سب سے خطرناک شکل ہوتی ہے جو ان نام نہاد انقلابیوں کو عوام سے کاٹ کر انقلابی خبط کا شکار جنونیوں کے ایک ٹولے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس لیے جبر کی معاشی بنیادوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ سیاسی بنیادوں کے خاتمے کی جدوجہد بھی ضروری ہوتی ہے۔

بالشویک انقلاب 1917ء سے قبل پولینڈ کے بالشویکوں میں یہ فرقہ پرور رجحان غالب آ رہا تھا جس کی لینن نے شدید مذمت کی تھی۔ حقِ خودارادیت پر اپنے درجن بھر تھیسز کے سلسلے کو سمراپ کرتے ہوئے ان پولش بالشویکوں کے جواب میں لینن لکھتا ہے کہ ''سوشلزم میں قوموں کے حقِ خودارادیت سے انکار ہماری نظر میں سوشلزم سے غداری ہو گا۔ ہمیں جواباً یہ کہا جاتا ہے کہ 'سوشلسٹ سماج میں حقِ خودارادیت ناقابلِ عمل ہے۔' فرق بہت بڑا ہے۔ یہ نتیجہ کہاں سے اخذ کیا جاتا ہے؟ ہمیں اپنے مخالفین کے طرزِ استدلال کا علم ہے۔ وہ یہ دلیل دیں گے کہ 'سوشلزم قومی جبر کی ہر شکل کو ختم کر دیتا ہے کیونکہ وہ ان طبقاتی مفادات کو ہی یکسر مٹا دیتا ہے جو قومی جبر کی بنیاد بنتے ہیں'۔ یہ دلیل جو قومی جبر کے خاتمے کی معاشی بنیادوں سے متعلق ہے، اس پر کوئی اختلافِ رائے

موجود نہیں ہے لیکن اس دلیل کا ایک قوم کے دوسری قوم کی ریاستی سرحدوں میں زبردستی گھس بیٹھنے کی مخصوص سیاسی جبر کی شکل سے کیا تعلق ہے؟ یہ اہم سیاسی سوال سے کنارہ کشی کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ان کے مزید دلائل ہمارے اس نتیجے کی حوصلہ افزائی ہی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ 'ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک سوشلسٹ سماج میں قوم معاشی و سیاسی اکائی کے طور پر وجود رکھے گی۔ قوم زیادہ سے زیادہ ایک ثقافتی یا لسانی اکائی کے طور پر رہ سکتی ہے کیونکہ ایک سوشلسٹ ثقافتی زون کی علاقائی تقسیم اگر ضروری بھی ہو تو محض پیداوار کی ضروریات کے تحت ہی ہوگی۔ اور مزید برآں اس قسم کی تقسیم کا معاملہ کوئی بھی انفرادی قوم اپنی آزاد اور خود مختارانہ حیثیت (جیسا کہ حقِ خود ارادیت کے تحت ہوتا ہے) میں نہیں کرے گی بلکہ تمام متعلقہ شہری مل جل کر (مشترکہ فیصلہ سازی) طے کریں گے'۔ ہمارے پولینڈ کے کامریڈیوں حقِ خود ارادیت کی جگہ مشترکہ فیصلہ سازی کی دلیل دیتے ہوئے اس حد تک اصرار کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بات میں اسے تین بار دہرایا ہے۔ بار بار دہرانے سے یہ رجعتی دلیل ایک سوشلسٹ دلیل میں تبدیل نہیں ہو جاتی۔ تمام رجعتی حکمران اور بورژوا اپنی ریاستی سرحدوں میں جبراً رکھی گئی قومیتوں کو ایک مشترکہ پارلیمان میں مشترکہ فیصلہ سازی کا حق تفویض کرتے ہیں جیسے جرمن سلطنت میں ولہیم دوم جرمن پارلیمان میں بیلجین باشندوں کو مشترکہ فیصلہ سازی کا حق دیتا ہے۔ ہمارے مخالفین اسی نکتے سے یعنی جو سوال زیرِ بحث ہے یعنی حقِ علیحدگی کے سوال سے کترا کر گزر جاتے ہیں۔ یہ اگر المیہ نہیں ہے تو مضحکہ ضرور ہے۔۔۔ سرمایہ داری کے تحت قومی یا کسی بھی دوسرے سیاسی جبر کا خاتمہ ناممکن ہے کیونکہ اس کے لیے طبقات ختم کرنے ہوں گے یعنی سوشلزم کو لاگو کرنا ہوگا لیکن اگرچہ اس کی بنیادیں معاشی ہوتی ہیں لیکن پھر بھی سوشلزم کو محض معیشت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بنیاد یعنی سوشلسٹ پیداوار قومی جبر کے خاتمے کے لیے ضروری ہے لیکن اس بنیاد کو جمہوری طور پر منظم ریاست اور عوامی فوج وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرمایہ داری کو سوشلزم سے بدلتے ہوئے پرولتاریہ قومی جبر کے خاتمے کے امکانات کو تخلیق کرتا ہے لیکن یہ امکانات صرف اور صرف اسی صورت میں حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں جب تک ہر شعبے بشمول آبادی کی خواہشات کے مطابق ریاستی سرحدوں کا تعین اور علیحدگی کی مکمل آزادی سمیت مکمل جمہوریت کا نفاذ نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں رتی برابر بھی قومی دراڑ اور قومی بداعتمادی کے خاتمے کی بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں تاکہ تیزی سے قوموں کا انضمام مکمل ہو سکے اور ریاست کے رفتہ رفتہ مٹنے کا عمل پایہ تکمیل کو

پہنچے"۔(قومی خودمختاری پر بحث کا سم اپ، لینن، جولائی 1916ء)

اوپر دیئے گئے لینن کے الفاظ معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔اور خاص طور پر پاکستان جیسی ریاست میں جہاں حکمران طبقات اور ریاستی اداروں کا کردار انتہائی سفاکیت پر مبنی ہو وہاں جمہوری مطالبات کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔24 جنوری 2017ء کے ڈان اخبار کی ایک رپورٹ کے مطابق 2016ء میں پاکستان میں گمشدہ افراد کی فہرست میں 728 نئے لوگوں کا اضافہ ہوا۔ 2015ء میں 649 کیس رجسٹر کیے گئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق گزشتہ چھ سالوں میں انکوائری کمیشن کو ملک بھر سے جبری گمشدگیوں کی 3740 شکایات موصول ہوئیں۔ جن میں اسلام آباد سے 121، پنجاب سے 752، سندھ سے 1010، خیبر پختونخواہ سے 1425، بلوچستان سے 276، فاٹا سے 112، کشمیر اور گلگت سے 140 کیس شامل ہیں۔ایسے حالات میں گمشدہ لوگوں کی بازیابی سمیت دیگر جمہوری مطالبات کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور باقی لازمی معروضی عناصر کی موجودگی کی صورت میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ سوشلسٹ انقلاب کا آغاز بھی کسی جمہوری مطالبے کی تحریک سے ہو جائے۔حقِ خودارادیت بھی بنیادی طور پر ایک جمہوری مطالبہ ہے اور اسی طرح جن خطوں میں پاکستانی افواج کا کنٹرول ہے وہاں سے افواج کے نکل جانے کا مطالبہ یا یونیورسٹیوں اور کالجوں وغیرہ سے وردی والوں کی بے دخلیوں کے مطالبے، سب جمہوری مطالبے ہیں اور ہم ان مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔لیکن یہ بات صرف اسی حد تک ہی درست ہے اور اس سے زیادہ اس کی اہمیت اور افادیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا دانستہ مبالغہ آرائی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔کیا لینن کے حقِ خودارادیت کے اصول کا مطلب یہ ہے کہ مارکس وادی قوموں کی آزادی کی جدوجہد میں مزدوروں کو منظم کرنے کی جدوجہد کو قربان کر دیں؟ یا پھر یہ کہ پہلے مرحلے پر صرف قوموں کی آزادی کی جدوجہد کی جائے اور پھر بعد میں مزدور تحریک کی بات کی جائے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ لینن کے مذکورہ بالا الفاظ میں بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری کے خاتمے کے بغیر مظلوم قوموں کی حقیقی آزادی ممکن نہیں ہے۔اس لیے مظلوم قوموں کی جدوجہد کو ناگزیر طور پر مظلوم طبقات کی جدوجہد کے زیرِ اثر ہی کامیابی سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے۔ یہ موقف ٹراٹسکی کے نظریۂ مسلسل انقلاب سے سو فیصد مماثلت رکھتا ہے جس میں ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے کہ تیسری دنیا میں بورژوازی کے تاریخی فریضے بھی پرولتاریہ کو ہی ادا کرنے ہوں گے۔

ماضی میں یہاں کے بائیں بازو نے قوم پرستی اور سوشلزم میں خطِ امتیاز ہی ختم کر دیا تھا۔ خاص طور پر محکوم قومیتوں کے سوشلسٹ لگ بھگ قوم پرست ہی ہوتے تھے۔ اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ کمیونسٹوں کا فرض ہے کہ ہر قیمت پر آزادی کی تحریک کی حمایت کریں چاہے اس کی قیادت کوئی بھی کر رہا ہو۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم پرستی اور سوشلزم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ لینن نے اپنی ساری زندگی قوموں کے حقِ خودارادیت کا دفاع کیا لیکن اس نے کسی ایک بھی تحریر یا تقریر میں بورژوازی کی قیادت اور اس کی قیادت کرنے کی اہلیت کا دفاع نہیں کیا۔ بلکہ ان تمام رجحانات کی شدت سے مخالفت کی جو مزدور تحریک میں مخالف طبقات یعنی بورژوازی کے دباؤ کی غمازی کرتے ہیں۔ لینن نے یہاں تک کہا کہ اکثر اوقات مظلوم قومیتوں کے حکمران طبقات ظالم قوم کے حکمران طبقات سے بھی زیادہ غلیظ اور گھناؤنے کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قوم پرستی اور سوشلزم دو الگ الگ نظریات ہیں۔ قوم پرستی بورژوازی کا نظریہ ہے اور سوشلزم محنت کشوں کا۔ یہ ایک دوسرے کے متضاد نظریات ہیں۔ قوموں کے حقِ خودارادیت کو تسلیم کرنے یا اس کا دفاع کرنے کے لیے قوم پرست ہونا ضروری نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے خواتین کے حقوق کی جدوجہد کرنے کے لیے فیمینسٹ ہونا اور پریس کی آزادی کی جدوجہد کرنے کے لیے لبرل ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے مارکس وادیوں پر یہ شرط عائد نہیں ہوتی کہ وہ ہر قسم کی معروضی صورتحال میں اور ہر طرح کی قیادت میں قومی آزادی کی تحریک کی حمایت کریں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جب مارکس وادیوں کو قومی آزادی کے نعرے کی مخالفت کرنی پڑ جائے؟ تو اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اگر کسی قومی آزادی کی تحریک میں محنت کش عوام کی شمولیت نہ ہونے کے برابر رہ جائے اور اس تحریک کی قیادت مسلسل غداریوں کے باعث عوام کی حمایت کھو چکی ہو یا کسی اور سامراجی طاقت کے آگے اس تحریک کا سودا کر چکی ہو تو مارکس وادی کبھی بھی ایسی تحریک کی حمایت کرنے کے پابند نہیں ہونگے۔ سب سے بڑھ کر یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مارکس وادی طبقات سے پاک معاشرے کے لیے برسرِ پیکار ہیں اور یہ جدوجہد کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے۔ اس لیے کسی بھی قومی آزادی کی تحریک کا عالمی مزدور تحریک کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے یہ مارکس وادیوں کے سامنے سب سے بڑا سوال ہوتا ہے۔ جس طرح لینن نے کہا تھا کہ 'اگر ہمیں جرمنی کے انقلاب کے لیے روس کا انقلاب قربان بھی کرنا پڑے تو ہم لمحے بھر کا بھی

توقف نہیں کریں گے۔ لینن نے خود حقِ خودارادیت پر اپنی بات کو سم اپ کرتے ہوئے اس سوال پر بحث کی ہے کہ کیا مارکس وادی کسی قومی آزادی کی تحریک کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ آیئے لینن سے اس کا جواب مانگتے ہیں۔

''مارکس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زارشاہی کی مطلق العنانیت، مروجہ جبر اور رجعتی اثر و رسوخ کے خلاف برسرِ پیکار یورپی جمہوریت کے مفاد میں اس نے پولینڈ کی آزادی کی حمایت کی۔ مارکس کا نقطہ نظر اس وقت درست ثابت ہو گیا جب 1849ء میں ہنگری کی قومی آزادی اور انقلابی جمہوریت کی بغاوت کو روسی فوج نے کچل ڈالا۔ تب سے مارکس کی زندگی کے آخری ایام تک اور حتیٰ کہ مارکس کے بعد 1890ء تک جب تک یہ خطرہ موجود رہا کہ روس فرانس کے ساتھ مل کر جرمنی کی قومی خودمختاری اور غیر سامراجی ریاست پر رجعتی جنگ مسلط نہ کر دے، اینگلز زارشاہی کے خلاف جدوجہد کے ہراول دستوں میں موجود رہا۔ اسی وجہ سے (جس وجہ سے پولینڈ کی آزادی کی حمایت کی گئی) اور صرف اور صرف اسی وجہ سے مارکس اور اینگلز چیک اور جنوبی سلاویوں کی قومی تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ مارکسزم کے ایک دیانتدار طالبِ علم جو صرف لفظی جگالی کی حد تک انقلابی نہ ہو، کے لیے مارکس اور اینگلز کی 49-1848ء کی تحریروں کا سرسری سا جائزہ بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہوگا کہ مارکس اور اینگلز نے یورپ میں روس کی خارجہ پالیسی کے ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے والی (Outposts) رجعتی قومیتوں اور جرمنی، پولز اور میگار وغیرہ یعنی انقلابی قومیتوں کے مابین خطِ امتیاز کھینچ دیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کا اظہار 1848ء میں اس وقت ناقابلِ تردید سچائی کی صورت میں ہوا جب انقلابی قومیتوں نے آزادی کے لیے لڑائی لڑی تو ایک طرف ان کے مقابل ان کی اصولی دشمن روس کی زارشاہی تھی اور دوسری طرف چیک وغیرہ کی رجعتی قومیتیں تھیں جو زارشاہی کے خارجی اوزار تھے۔ اس ٹھوس مثال سے کیا اسباق حاصل کیے جا سکتے ہیں؟ یا یوں کہہ لیجئے کہ اگر مارکسزم کی اصل روح تک پہنچنا مقصود ہو تو مذکورہ بالا مثال سے یہ ٹھوس نتائج برآمد ہوں گے کہ اول تو یہ کہ یورپ میں بڑی اور بہت بڑی قومیتوں کی آزادی کے مفادات چھوٹی قومیتوں کی آزادی کی تحریکوں کے مفادات سے برتر ہیں۔ اور دوئم یہ کہ جمہوریت کے مطالبے کو قومی حدود کی چار دیواری کے اندر کی بجائے یورپی بلکہ ہمارے عہد میں عالمی پیمانے پر دیکھا اور سمجھا جانا چاہیے۔ اس سوال پر یہ ایک مکمل نقطہ نظر ہے اور اس نقطہ نظر میں سوشلزم کے اس بنیادی اصول سے کوئی انحراف موجود نہیں جس کو پولینڈ کے

ساتھیوں نے بھلا دیا ہے مگر مارکس اس پر ہمیشہ کاربند رہا۔ اور وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی بھی قوم اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتی جب تک وہ دوسری قومیتوں پر جبر کرتی رہے۔ اگر وہ ٹھوس مادی حالات جن کا مارکس کو اس وقت سامنا تھا جب زارشاہی کا بین الاقوامی سیاست پر غلبہ تھا اپنے آپ کو دہراتے ہیں، مثال کے طور پر کچھ قومیں سوشلسٹ انقلاب کا آغاز کرتی ہیں (جس طرح 1848ء میں یورپ میں بورژوا جمہوری انقلاب کا آغاز کیا گیا تھا) اور دوسری قومیں بورژوا رجعتیت کے دفاع کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی ہیں تو ایسی صورتحال میں، میں (لینن) بھی آخر الذکر کے خلاف انقلابی جنگ کی حمایت کرونگا، حتیٰ کہ میں ان کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے، ان کی تمام آلہ کار قومیتوں کو برباد کرنے کی حمایت کرونگا چاہے ان میں چھوٹی قومیتوں کی تحریکیں ہی شامل کیوں نہ ہوں۔ نتیجتاً یہ بظاہر مارکسزم سے انحراف نظر آتا ہے لیکن مارکس کے طریقہ کار کی کسی بھی مثال کی تردید کے بجائے یہ مارکسزم کا دفاع ہے۔ ہمیں ہر ٹھوس صورتحال کا گہرائی میں تجزیہ کرنے اور مستقبل کے لیے قابلِ قدر اسباق اخذ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقِ خودارادیت سمیت بہت سے جمہوری مطالبے قطعی ہونے کی بجائے جمہوریت کی عالمی عمومی تحریک (آج کل عالمی سوشلسٹ تحریک) کا چھوٹا سا حصہ ہیں۔ ٹھوس انفرادی معاملے میں جزو کُل سے متصادم ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہو تو اسے مسترد کر دینا چاہیے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک ملک میں ریپبلکن تحریک کسی دوسرے ملک کے رجعتی مذہبی یا مالیاتی آمروں کی آلہ کار ہو۔ ایسی صورت میں ہمیں اس جزو کی ٹھوس تحریک کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن یہ مضحکہ خیز ہوگا کہ ان بنیادوں پر بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کے پروگرام سے ریپبلک کے مطالبے کو نکال باہر کیا جائے"۔ (ایضاً)

ہمارے خیال میں قومی سوال کے دونوں پہلوؤں پر لینن نے دوٹوک اور واضح اصول مرتب کر دیئے ہیں۔ لینن ازم کو اپنی تنگ نظر قوم پرستی کے دفاع کے لیے استعمال کرنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ اور لینن کے الفاظ سے ہم جو اسباق حاصل کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ حقِ خود ارادیت کا اصول کوئی لگا بندھا فارمولا نہیں جسے کہیں پر بھی اندھا دھند مسلط کر دیا جائے بلکہ یہ ایک کُل کا اہم ہی سہی لیکن ایک جزو ہے۔ اور عالمی مزدور تحریک کے تناظر اور پسِ منظر میں ہی کسی بھی تحریک کے کردار کو سمجھنا اور اس میں مداخلت کرنی چاہیے۔ ہمیں مارکس یا لینن کی تحریروں کو ازبر یاد نہیں کرنا بلکہ آج کے عہد میں جب لینن کی مذکورہ بالا تحریر کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور بہت کچھ بدل چکا ہے، اس تبدیل شدہ صورتحال میں مختلف قومی تحریکوں میں مداخلت کرنی ہے

اوران کی سرگرم حمایت، لاتعلقی یا مخالفت کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی تحریک ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے کردار کی نفی کر دے۔ ایک وقت میں انقلابی کردار کی حامل ایک تحریک کسی اور وقت میں رجعتی یا آلہ کار تحریک بھی ہوسکتی ہے۔ ہمیں رومانویت پسندوں کی طرح 'ہر محفل میں ایک ہی راگ نہیں الاپنا' بلکہ تخلیقی انداز میں اپنے عہد کے مسائل کو حل کرنا ہے۔ جیسے ابھی گزشتہ کچھ عرصے میں یورپ میں بریگزٹ کی شکل میں اور اس کے بعد قومی تحریکوں کا ابھار دکھائی دے رہا ہے، خاص طور پر کیٹالونیا کے ریفرنڈم میں حصہ لینے والے 90 فیصد ووٹروں نے آزادی کی حمایت کی۔ اسی طرح مشرقِ وسطیٰ میں عراقی کردستان میں ہونے والے ریفرنڈم میں 92 فیصد ووٹروں نے آزادی کی حمایت کی تو یہاں بھی کچھ رومانویت پسندوں کے جذبات مچلنے لگے اور یہ کہا اور سمجھا جانے لگا کہ شاید پھر سے قومی تحریکوں کا احیا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیٹالونیا اور کردستان دونوں مثالوں سے یہ صاف واضح ہو گیا کہ آج کے عہد میں کسی بھی انفرادی قومی آزادی کی تحریک میں کامیابی ممکن نہیں جب تک خطے کے محنت کش عوام کی بھاری اکثریت کی حمایت نہ جیت لی جائے اور یہ صرف طبقاتی جڑت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یعنی یورپ کی سوشلسٹ فیڈریشن میں ہی کیٹالونیا کی آزادی کا خواب پورا ہوسکتا ہے اور مشرقِ وسطیٰ کی سوشلسٹ فیڈریشن کے بغیر کرد قومی مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ اس لیے جہاں ان تحریکوں کی حمایت ضروری ہے وہیں ان تحریکوں کو عالمی مزدور تحریک کے اجزا کے طور پر ایک کل کے اندر ہی دیکھنا اور ان کے حوالے سے سیاسی نقطہ نظر مرتب کرنا چاہیے۔ ایسے ہی پاکستان کی ریاست میں مختلف قومی آزادی کی تحریکوں کو کسی مجرد زاویے کی بجائے ان کے ٹھوس معروضی حالات کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔

بلوچستان

گزشتہ ستر سالوں میں پاکستان میں آزادی کی سب سے بڑی آواز بلوچستان سے ابھرتی رہی ہے جہاں 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں اور پھر اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں بہت بڑی بڑی بغاوتیں دیکھنے میں آئیں۔ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (BSO) کا انہی انقلابی ابھاروں کے ذریعے جنم ہوا اور اسی لیے یہ بلوچستان کے حریت پسندوں کی روایت بن گئی۔ لیکن بار بار تحریکوں کو قیادت کی نظریاتی کمزوریوں، غداریوں اور غلط حکمتِ عملیوں کی بھینٹ چڑھنا پڑا۔

خاص طور پر کبھی بھی بلوچستان کی آزادی کی تحریک کو پاکستان کی عمومی تحریک اور خطے اور دنیا کی عالمی تحریکوں سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن دوسری طرف قوم پرستوں کی نفرت کے محور پنجاب (جس کے حکمران طبقات کا خطے میں استعماری کردار رہا ہے) میں بھی چلنے والی کسی بھی تحریک کی قیادت ایسے عناصر کے ہاتھ نہیں لگ سکی جو مظلوم قومیتوں کو ساتھ لے کر اس جابر ریاست کو اکھاڑ سکتی۔ سوویت یونین کے دور میں یہ تحریک کسی حد تک سوویت بیوروکریسی کے زیرِ اثر رہی مگر سوویت بیوروکریسی بھی ان تحریکوں کو کوئی راستہ نہیں دے رہی تھی بلکہ اس نے اس ملک میں 69-68ء کی تحریک کو بھی برباد کر ڈالا۔ اسی طرح مسلح جدوجہد کے غلط طریقہ کار کے باعث ہر بار یہ تحریکیں بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے باوجود بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکیں۔ اور سوویت یونین کے بعد اس تحریک میں جو کسی حد تک ترقی پسند عناصر کا غلبہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا اور تحریک کی قیادت دائیں بازو کی طرف سرکنا شروع ہو گئی۔ آزاد سوشلسٹ بلوچستان کا پروگرام پسِ پشت ڈال دیا گیا اور بیرونی مداخلت اور حمایت کے بلبوتے پر اسلحہ بردار جنگجوؤں کے ذریعے ایک طویل گوریلا جدوجہد جاری رکھی گئی جس کی وجہ سے ریاست کو بڑے پیمانے پر بلوچستان میں آپریشن کرنے اور وحشیانہ جبر کرنے کا جواز میسر آ گیا۔ وائس فار انٹرنیشنل بلوچ مسنگ پرسنز کے مطابق 2014ء تک 18000 بلوچ سیاسی کارکن لاپتہ ہو چکے تھے اور ان میں سے 2000 سے زائد قتل کیے جا چکے تھے۔ گوریلوں کی آڑ میں ریاست نے بلوچستان کے حریت پسند سیاسی کارکنوں کی ایک پوری نسل کو برباد کر ڈالا۔

یہ مسلح تحریک اب کافی حد تک پسپا ہو چکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی قیادت میں مرکزیت کا فقدان ہے۔ تحریک کے کئی دھڑے بن چکے ہیں اور مختلف ناموں سے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بھی برسرِ پیکار ہیں۔ یہ متحارب دھڑے خود بہت سے بلوچوں کے قتل میں بھی ملوث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب کافی حد تک یہ تحریک نظریات سے عاری عناصر کے ہاتھوں یرغمال بنائی جا چکی ہے۔ سی پیک منصوبے کے بعد پاکستانی ریاست کے حاکم دھڑے اور چین نے گوادر کو معاشی و فوجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے سارے خطے کو جلد از جلد غیر مسلح کرنے کے عمل کو تیز کیا ہے اور بلوچ آبادی کے اضلاع میں آپریشن کی شدت کو تیز کیا گیا ہے۔ جبکہ امریکہ اور انڈیا چین کے اس خطے میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے قطعاً خوش نہیں ہیں اور وہ ان قوم پرست عناصر کے نظریاتی دیوالیہ پن کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ خطے کو غیر

مستحکم کر کے ایک تو چین کی مداخلت یعنی سی پیک کو ناکام کیا جائے، دوسرا افغانستان میں پاکستانی ریاست کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کیا جا سکے۔ اس صورتحال میں زیادہ تر بلوچ قیادت جو بیرونِ ملک مقیم ہے امریکہ کی کھلم کھلا حمایت کر رہی ہے۔ وہی امریکہ جو کیٹالونیا اور کردستان کی آزادی کی تحریکوں کی علی الاعلان مخالفت کر چکا ہے اسی کو بلوچوں کا خیر خواہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ کچھ سال قبل بلوچستان کی آزادی کے لیے ایک ریپبلکن امریکی سینیٹر نے قرارداد بھی پیش کی تھی۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے آنے کے بعد ان بلوچ رہنماؤں کے مزید وارے نیارے ہو گئے ہیں اور اب یہ نہ صرف امریکہ بلکہ سارے یورپ میں کھل کر پاکستانی ریاست کے خلاف اور آزادی کے حق میں اپنی پروپیگنڈا مہم کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کشمیر واچ ڈاٹ کام کی ایک رپورٹ کے مطابق 14-12 جون 2017ء کو ہونے والے ہیومن رائٹس کونسل کے 35 ویں سیشن کے دوران جنیوا میں بلوچ، سندھی اور Uyghur چین کے قوم پرستوں کی ایک میٹنگ کرائی گئی ہے۔ اس سیشن میں مہران مری نے بھی خطاب کیا اور عالمی سندھ کانگریس (WSC) کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ اگست 2017ء میں واشنگٹن ڈی سی کے نیشنل پریس کلب میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان تھا 'نواب اکبر بگٹی کے قتل کے پسِ پردہ سیاسی محرکات'۔ تقریب سے سابقہ پاکستانی سفیر حسین حقانی، بلوچ رہنما براہمداغ بگٹی (سوئٹزرلینڈ سے سکائپ کے ذریعے)، مری قبیلے کے سردار اور بلوچستان ہاؤس کے صدر مہران مری، بلوچستان نیشنل موومنٹ کے ترجمان حمل حیدر اور BSO آزاد کی چیئرپرسن کریمہ بلوچ نے خطاب کیا۔ 30 ستمبر 2017ء کو فری بلوچستان موومنٹ نے جرمنی گوٹنگن میں احتجاجی ریلی نکالی۔ یکم اکتوبر 2017ء کو برطانوی وزیرِ اعظم ہاؤس کے باہر BSO آزاد نے بلوچستان میں پاکستان کے جنگی جرائم کے خلاف احتجاج کیا۔ اپنے سیاسی مطالبات کے لیے احتجاج کرنا ایک بالکل جائز اور درست راست اقدام ہے لیکن گزشتہ کچھ عرصے میں ان واقعات کی رفتار میں اچانک تیزی آنا بہت معنی خیز دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سب عین اس وقت ہو رہا ہے جب ڈونلڈ ٹرمپ نے جنوبی ایشیا میں نئی امریکی پالیسی کا اعلان کیا ہے اور پاکستان کی ایک اتحادی کی حیثیت ختم کر کے انڈیا کے ساتھ سو سالہ پارٹنرشپ کا معاہدہ کیا گیا ہے۔ اسی عرصے میں ہی الطاف حسین اور بلوچ قوم پرستوں کی لندن میں ملاقات کی اطلاعات ملی ہیں۔ اس حوالے سے صاف نظر آ رہا ہے کہ اب بلوچستان کی اس قیادت نے عوامی طاقت کے بلبوتے کی بجائے کھل کر

امریکہ اور انڈیا کے دم پر آزادی لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے معذرت خواہان کھل کر یہ بوسیدہ اور عملیت پسندانہ دلیل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ 'دشمن کا دشمن بھی دوست ہی ہوتا ہے'۔ مگر یہ یاد رہے کہ امریکہ نے شام کے کردوں کو اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کیا ہے لیکن کیا امریکہ شام کے کردوں کی مکمل آزاد ریاست کی حمایت کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح کیا بلوچستان کے یہ قوم پرست ایسے خونخوار اژدھے سے تو دوستی نہیں کر رہے ہیں جو زیادہ بھوک لگنے پر اپنے ہی بچوں کو بھی نگل جایا کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں امریکی سامراج اس وقت کرۂ ارض کی سب سے رجعتی طاقت ہے جو عراق، افغانستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک کی مظلوم قومیتوں کے قتلِ عام میں ملوث ہے۔ امریکی سامراج سے ہاتھ ملانے کا مطلب ہزاروں بلوچ نوجوانوں کے خون سے غداری ہے۔

دوسری طرف پاکستانی ریاست کے اندر بھی ایک دھڑا قومی، لسانی و فرقہ وارانہ تضادات کے تسلسل کو داخلہ پالیسی کا اہم حصہ سمجھتا ہے۔ ان کے خیال میں قومی و لسانی تضادات کو ہوا دے کر عوام کی حقیقی انقلابی بغاوت کو مایوس اور بدظن کیا جا سکتا ہے اور یوں اپنی لوٹ مار کو بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی واضح مثال ہمیں حال ہی میں اسلام آباد میں قائدِ اعظم یونیورسٹی کی طلبہ کی تحریک میں نظر آئی جہاں طاقت کے زور پر طلبہ نے دس فیصد فیس میں اضافے کی واپسی سمیت بہت سے مطالبات تسلیم کرا لیے۔ لیکن انتظامیہ نے حیران کن طور پر خارج کیے گئے بلوچ طلبہ کے واپس داخلے کی شرط ماننے سے انکار کر دیا اور ان بلوچ طلبہ پر تشدد اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے طلبہ کی اس تحریک کا تاثر ایک طلبہ تحریک سے زیادہ قومی تحریک کا بن گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کے اس شدید معاشی بحران کی کیفیت میں جہاں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے فنڈ ہی ریلیز نہیں کیے جا رہے وہاں یونیورسٹی انتظامیہ جب فیسوں میں کمی کا بظاہر ناممکن دکھائی دینے والا مطالبہ تسلیم کر سکتی ہے تو ایسی صورتحال میں بلوچ طلبہ کی بحالی سے کون سی قیامت آ جانی تھی؟ طلبہ کو اس کیخلاف بھوک ہڑتال تک کرنا پڑی اور جب ان کی حالت انتہائی خراب ہو گئی تو تب جرمانے کرتے ہوئے انہیں بحال بھی کر دیا گیا۔ ایسے میں کچھ لوگ اسے محض وائس چانسلر کی ہٹ دھرمی قرار دے رہے تھے لیکن ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ درحقیقت ایک طلبہ تحریک کا چہرہ مسخ کر کے اور اسے قومی بنیادوں پر تقسیم کر کے اس تحریک کا پورے ملک میں پڑنے والا انقلابی تاثر زائل کر دیا گیا ہے کہ آج بھی فیسوں میں کمی جیسے مطالبات کے گرد تحریکیں لڑی اور جیتی جا سکتی ہیں۔ اس سے قبل حال ہی میں ہونے والی مردم شماری کے نتائج بھی کافی

مشکوک رہے ہیں جن میں پنجاب میں آبادی میں بڑے پیمانے پر اضافہ دکھایا گیا ہے مگر اسی تناسب سے باقی صوبوں میں اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ 11 ستمبر 2017ء کے ڈان اخبار میں مبارک زیب خان کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ 19 سالوں میں بلوچستان کے 21 اضلاع میں بلوچی بولنے والوں کی آبادی بڑھنے کی بجائے کم ہوئی ہے۔ بلوچ اکثریتی اضلاع میں بلوچوں کی آبادی 61 فیصد سے کم ہو کر 55.6 فیصد رہ گئی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ علاقے کے حالات کے پیشِ نظر آبادی کی کچھ پرتیں کراچی یا ملک کے دیگر علاقوں کی طرف ہجرت کر گئی ہوں۔ لیکن کراچی کی آبادی بھی حیران کن حد تک اندازوں سے بہت کم ظاہر کی گئی ہے۔ اس سے اس مردم شماری کے نتائج ناقابلِ قبول حد تک مشکوک ہو گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر مخصوص سیاسی گروہوں اور پارٹیوں کو ایک سیاسی نان ایشو مہیا کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اس سیاسی نان ایشو کو بھی استعمال کرنے کی طاقت ان دو نمبر سیاسی قیادتوں میں دکھائی نہیں دے رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری بلوچ قوم پرست قیادت عوام سے کٹ چکی ہے۔ لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ بلوچوں کی اکثریت محبِ وطن پاکستانیوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ آج پاکستانی فوج اور ایجنسیوں سے بلوچ عوام جتنی نفرت کرتے ہیں شاید ماضی میں کبھی بھی نہ کرتے ہوں۔ اور یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ قومی محرومی کے احساس میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے لیکن تحریک کی قیادت سے بھی لوگ مایوس ہو چکے ہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر اللہ نذر سے کسی حد تک آج بھی بلوچوں کے درمیانے طبقے کی توقعات وابستہ ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ توقعات بھی دم توڑ رہی تھیں لیکن اچانک اس کے بیوی بچوں کو اٹھا کر ایجنسیوں نے خود اس کی مرتی ہوئی حمایت کو کسی حد تک آکسیجن فراہم کی ہے۔ ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ مسلح جدوجہد کا طریقہ کار بلوچستان میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ لیکن قومی محرومی کے اظہار کے سیاسی ذرائع بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ پرانے سیاسی ڈھانچے اتنے گل سڑ چکے ہیں کہ ان کے ذریعے ایک تازہ دم تحریک کا ابھار مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ BSO جسے بلوچ نوجوان ماضی میں آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کا واحد پلیٹ فارم سمجھتے تھے وہ بھی بار بار کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد کافی حد تک غیر موثر ہوئی ہے۔ جہاں مسلح جدوجہد کی کامیابی کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں وہیں دوبارہ بلوچستان میں ایک سیاسی تحریک کے امکان روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئٹہ، خضدار، تربت

اور دیگر شہروں کے تعلیمی اداروں میں بڑی تعداد میں بلوچ نوجوان زیرِ تعلیم ہیں جو آج موبائل اور انٹرنیٹ کی سہولتیں استعمال کرتے ہیں اور عالمی تحریکوں کی جانکاری سے ان کا سیاسی شعور بھی غیر محسوس طریقے سے بلند ہو رہا ہے اور یہ ایک معیاری جست کے ساتھ خوف کی فضا کو پھاڑ کر ایک بڑی بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ بلوچستان میں سیاست کو ختم کرنے کے لیے ریاست ہر حد تک جا چکی ہے۔ اب اتنا خوف پھیلایا جا چکا ہے کہ وہ خوف اپنی ممکنہ نفسیاتی حد کو چھو رہا ہے۔ بلوچ نوجوان گولیاں چلانے سے زیادہ سیاست کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا اظہار اختر مینگل اور نیشنل پارٹی کے گزشتہ برس کوئٹہ، خضدار وغیرہ میں ہونے والے جلسوں سے ہوا ہے۔ لیکن لوگ اس قیادت کو بھی شکوک وشبہات کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان کے خوف کی نہیں بلکہ بلند شعور کی عکاسی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ایسی قیادت ہو جو سوشلسٹ انقلاب کے پروگرام کو عوام کی فوری عبوری ضروریات کے مطالبات کے ساتھ جوڑتے ہوئے پاکستان کے دیگر علاقوں کی تحریک کے ساتھ جوڑنے کا پروگرام بھی دے تو اسے وسیع سیاسی حمایت مل سکتی ہے۔

خاص طور پر گزشتہ دہائی میں بلوچستان میں محنت کش طبقے کے حجم اور اس کے سیاسی کردار میں بہت تیزی سے اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ صرف وہی لوگ جو عملی سیاست کی بجائے دانشورانہ مباحث پر زیادہ وقت صرف کرتے ہیں، محنت کش طبقے کے وجود سے انکار کر سکتے ہیں۔ ریلوے، واپڈا، PTCL، OGDCL، پاکستان پوسٹ، PWD، پیرا میڈیکس، زراعت، اریگیشن، محکمہ تعلیم، نرسنگ، تعمیرات اور محکمہ بلدیات کے علاوہ مرک مارکر جیسی ملٹی نیشنلز، گڈانی شپ بریکنگ، ڈی جی سیمنٹ اور حب کے انڈسٹریل ایریا میں کل ملا کر لاکھوں کی تعداد میں محنت کش کام کر رہے ہیں۔ اور ان محنت کشوں کی زیادہ تر پرتوں میں گزشتہ چند سالوں میں سیاسی تحرک دیکھنے میں آیا ہے۔ کوئٹہ پریس کلب اس وقت شاید ملک کے چند سب سے مصروف پریس کلبوں میں شمار ہوتا ہے۔ محنت کشوں کی تعداد اور سیاسی تحرک میں اضافے سے بلوچستان کا عمومی سیاسی ماحول بھی متاثر ہو رہا ہے۔ طلبہ بھی سوچ بچار اور غور وفکر پر مجبور ہو رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر بلوچ اور پشتون محنت کش ایک دوسرے کے ساتھ مل کر معاشی مطالبات کے گرد منظم ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ٹریڈ یونین قیادتیں ان کو راستہ نہیں دے رہیں لیکن یہ تحریکیں مستقبل میں بلوچستان کی قومی محرومی کے جذبات کو بھی نئی سیاسی شکل اور متبادل فراہم کرنے کی طرف جا سکتی ہیں۔ اس حوالے سے بلوچستان کی آئندہ تحریک کے کردار میں معیاری تبدیلیاں دیکھنے میں آ سکتی ہیں اور پاکستان

اور خطے کی دیگر تحریکوں کے اثرات بھی اس مثبت ریڈیکلائزیشن کے عمل کو تقویت دے سکتے ہیں۔ یوں بلوچستان میں قومی تحریک کے ساتھ ساتھ طبقاتی مانگوں کے گرد ایک طاقتور مزدور تحریک بھی ابھر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے سنجیدہ خیر خواہاں پریشان ہیں اور وہ بلوچستان میں بلوچوں اور پشتونوں کے مابین تعصّبات کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تنگ نظر قوم پرستوں کی موجودگی میں ریاست اور ان کے سامراجی آقا اور مخالفین سب کے لیے بلوچستان کی سیاست میں مداخلت کے واضح امکانات موجود ہیں۔ امریکی سامراج پر اس وقت مسلط قیادت یعنی ڈونلڈ ٹرمپ کا سفارتی انداز انتہائی وحشیانہ اور سفاک ہے۔ یہ ایسا سامراج ہے جس کی دشمنی سے زیادہ دوستی خطرناک ہے۔ ہم سعودی عرب کی ریاست کو ابھی اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ امریکی قیادت کی یاری اور گماشتگی میں سعودی قیادت اندھی ہوگئی ہے اور سعودی شاہی خاندان کے اندر ایک خونریز خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ کچھ دن قبل محض دو دنوں میں دو شہزادوں سمیت درجنوں لوگ مارے جا چکے ہیں اور بیسیوں شہزادے گرفتار بھی کیے گئے ہیں۔ امریکی اور سعودی قیادتیں دونوں اندھی ہو چکی ہیں اور وہ یہ خونی کھلواڑ کر رہی ہیں جو ان کے کنٹرول سے بے قابو ہو کر ریاست کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا باعث بن سکتا ہے۔ ایسے ہی چین کے اثر و رسوخ کے خلاف اس خطے میں امریکی سامراج کوئی انتہائی بھیانک کھیل کھیلنے کی طرف جا سکتا ہے۔ ہم مارکس وادی اس پاکستانی ریاست کے وجود کو تسلیم کرنے سے برسوں پہلے ہی انکار کر چکے ہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ ایک سوشلسٹ متبادل کے بغیر سامراجی ایجنڈے کے تحت اس ریاست کا ٹوٹنا آج کے معروضی حالات اور خطے کی صورتحال میں انتشار اور بڑے پیمانے کی خون ریزی کو جنم دے سکتا ہے۔ چینی سامراج نے بھی دہشت گردوں میں اپنی پراکسیاں بنالی ہیں۔ خود پاکستانی ریاست اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے بلوچستان کے اندر پشتونوں اور بلوچوں کے درمیان تعصّبات کو ابھارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یوں ریاستی پالیسی ساز اور ان کے سامراجی آقا سب لوٹ اور ہوس کی اس جنگ میں خطرناک راستے پر چل رہے ہیں۔ 1947ء میں بھی سامراجی ایجنڈے کے تحت ایک تقسیم کے بعد مذہب کے نام پر قریباً 27 لاکھ لوگ قتل ہوئے تھے۔ آئندہ سالوں میں اگر سامراجی ایجنڈے کے تحت پھر کوئی تقسیم قومی بنیادوں پر ہوتی ہے تو وہ خانہ جنگی کی شکل اختیار کر کے پھر لاکھوں جانوں کے ضیاع کا سبب بن سکتی ہے۔ ایسے میں ریاست کے کسی بھی دھڑے کی پراکسی کی حقِ خودارادیت کے واہمے کے زیرِ اثر حمایت ایک تاریخی

جرم بن جائے گی۔ اس لیے ہم مارکس وادیوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ایسی صورتحال سے قبل ہی پشتون اور بلوچ نوجوانوں اور محنت کشوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر طبقاتی بنیادوں پر جوڑتے ہوئے سامراجیوں اور ریاستی اداروں کے خلاف ایک منظم بغاوت کا راستہ ہموار کریں اور اس بغاوت کو عالمی مزدور تحریک کے ایک جزو کے طور پر تعمیر کریں۔

کشمیر، گلگت بلتستان

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے ایک نوجوان مجاہد برہان وانی کے بھارتی فوج کے ہاتھوں قتل ہونے پر شروع ہونے والی نوجوانوں کی تاریخ ساز تحریکِ آزادی ابھی تک جاری ہے جس نے ہندوستان کی حکومت ہی نہیں ریاست کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس تحریک کا بنیادی خاصہ یہ ہے کہ یہ کوئی مسلح یا گوریلا جنگ نہیں ہے بلکہ گلیوں، شاہراہوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، سکولوں اور محلوں میں لڑی جانے والی سیاسی لڑائی ہے جس نے بھارتی ریاست کا چہرہ دنیا بھر کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔ اس تحریک نے ہندوستان بھر کے نوجوانوں میں بڑے پیمانے پر حمایت حاصل کی ہے اور انڈین دانشور جو درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انڈیا کا درمیانہ طبقہ شدید انڈین قوم پرست کہا جاتا ہے، ان میں بھی اپنی حمایت بنانے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی حال ہی میں انڈیا کی سب سے بڑی سمجھی جانے والی سیاسی جماعت کانگریس کے اہم ترین لیڈر سابقہ وزیرِ خارجہ چدم برم نے بھی مسئلہ کشمیر کا حل پیش کرتے ہوئے خودمختار کشمیر کی بات کی ہے جس کے بعد مودی اور بی جے پی نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور کانگریس کو کہنا پڑا کہ یہ چدم برم کا ذاتی موقف ہے، کانگریس کا سرکاری مؤقف نہیں ہے۔ لیکن اس سے کشمیر کے نوجوانوں کی تحریکِ آزادی کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت انڈیا کے حکمران طبقات میں اس ایشو کے حوالے سے پھوٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ کشمیر جو دنیا کا سب سے زیادہ ملٹرائزڈ زون ہے، وہاں اتنی بڑی سیاسی تحریک ناگزیر طور پر فوج کے مورال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ سرحد پر دشمن کی فوج پر گولی چلانا اور بات ہوتی ہے اور نہتے نوجوانوں پر ریاستی طاقت کا استعمال ایک بالکل الٹ معاملہ ہوتا ہے۔ ہزاروں نوجوان شدید زخمی ہوئے ہیں، درجنوں قتل کیے جا چکے ہیں اور سینکڑوں کی آنکھیں ضائع ہو چکی ہیں لیکن تحریک تھمنے کی بجائے مسلسل بڑھ رہی ہے۔ چند ماہ قبل تحریک میں سکولوں کی نوجوان لڑکیوں کی شمولیت نے تحریک کے مورال، توانائی اور کشمیر سے باہر حمایت میں

بڑے پیمانے پر اضافہ کر دیا ہے۔ تحریک کا سب سے اہم، انوکھا اور حیرت انگیز پہلو تحریک کی کسی بھی قیادت کا نہ ہونا ہے۔ آئی ایس آئی کی گماشتہ اور بھارت نواز قوم پرست قیادتیں، دونوں مکمل طور پر سیاسی دیوالیہ پن کا شکار ہو چکی ہیں اور ان کو دوبارہ تحریک پر مسلط کرنے کی بھارتی اور پاکستانی کوششوں کو منہ کی کھانی پڑی ہے۔ کشمیر کی سرحدوں پر سرحدی تنازعات میں اضافہ کرنے سے بھی تحریک ماند نہیں پڑی ہے۔ لیکن تحریک کی قیادت کا نہ ہونا صرف ایک حد تک ہی کارآمد اور مؤثر ہو سکتا ہے۔ آئندہ ہفتوں یا مہینوں میں عین ممکن ہے کہ یہ تحریک ایک نئی اور تازہ دم قیادت کو سامنے لے آئے۔ کشمیر کا بایاں بازو بھی اس تحریک کو کوئی راستہ دینے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ لیکن یہ تحریک لاامتناعی طور پر جاری نہیں رہ سکتی۔ اس کو کسی نہ کسی مقام پر جا کر تھمنا ہو گا لیکن اب یہ وقفے وقفے سے پھر نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ سیاسی افق پر اپنا اظہار کرتی رہے گی۔ کیونکہ بھارت کے دیگر علاقوں میں بھی طلبہ کی تحریکیں آگے بڑھ رہی ہیں اور مودی کی معاشی اصلاحات انہیں مزید مشتعل کریں گی اور سب سے بڑھ کر پورے ہندوستان سے آئے ہزاروں محنت کشوں نے مودی حکومت کی مزدور دشمن پالیسیوں کے خلاف دارالحکومت دہلی میں پارلیمنٹ کے سامنے تین روز دھرنا دیا۔ گو کہ ٹریڈ یونین قیادت کے اعلان کے مطابق اگر دھرنا ناکام ہو جاتا تو اس کے بعد اپنے مطالبات کے حق میں غیر معینہ مدت کی عام ہڑتال کا آغاز ہونا تھا مگر مزدور قیادت اپنی کمزوریوں کے باعث اس پر عمل درآمد نہ کر سکی۔ مگر بہت جلد محنت کشوں کی جانب سے دوبارہ یہ مطالبہ اٹھے گا اور ٹریڈ یونین قیادت کے لئے اس سے راہ فرار اختیار کرنا مشکل ہو گا۔ یہ صورتحال اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تو آئندہ چند سال بھارت میں بھی چھوٹی بڑی تحریکوں کے سال ہونگے، ایسے میں کشمیر کی تحریک بھی مکمل جمود کا شکار نہیں ہو سکتی۔

لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اُس پار اتنی شدید تحریک کے باوجود اِس پار بظاہر کوئی بڑی سیاسی ہلچل نظر نہیں آ رہی۔ اِس پار سوویت یونین کے انہدام کے بعد بھی نوجوانوں میں آزادی کے لیے خاصا جوش و خروش رہا ہے۔ لیکن قوم پرست قیادتیں نوجوانوں کے قومی جذبات کی ترجمانی کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہیں۔ کشمیر کی معیشت کا زیادہ تر انحصار بیرونِ ملک کام کرنے والے محنت کشوں کی بھیجی گئی رقوم پر ہی ہوتا تھا مگر اب عالمی معاشی بحران کی وجہ سے ترسیلاتِ زر خطرے میں ہیں۔ بیرونی ممالک سے آنے والی رقوم میں کمی کے باعث پہلے سے خستہ حال معیشت مزید دباؤ کا شکار ہوئی ہے اور درمیانے طبقے کے معیارِ زندگی میں گراوٹ آ رہی ہے۔ اس

سے نوجوانوں میں ہیجان دوبارہ بڑھے گا جو جلد یا بدیر سیاسی اظہار بھی کرے گا۔ مگر اس بار قومی آزادی کے نعروں کی بجائے مہنگی اور غیر معیاری تعلیم اور دیگر بنیادی ضروریات کے مطالبات کے گرد تحریک کے ابھرنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ ویسے بھی زیادہ تر قوم پرست قیادتیں کسی نہ کسی ملکی یا بیرونی ایجنسی کے آلہ کار کے طور پر کام کر رہی ہیں اور ان میں نوجوانوں کی کسی بھی تحریک پر اثر انداز ہونے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔

آؤٹ لک انڈیا ڈاٹ کام کی 12 اکتوبر 2017ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی ڈیفنس سیکرٹری جیمز میٹس نے حال ہی میں سینیٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ سی پیک ایک متنازعہ منصوبہ ہے کیونکہ یہ ایک متنازعہ علاقے سے گزر رہا ہے۔ کشمیری قوم پرستوں نے اس بیان کا خیر مقدم کیا ہے۔ یونائیٹڈ کشمیر پیپلز نیشنل پارٹی (UKPNP) کے خارجہ امور کے مرکزی سیکرٹری جمیل مقصود نے کہا ہے کہ 'ہم جیمز میٹس کے بیان کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ اس نے چینی سامراجیوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ ایک متنازعہ علاقے کو استعمال کر رہے ہیں'۔ اس کا مزید کہنا تھا کہ 'سی پیک کے تحت مظفر آباد کے قریب دریائے نیلم کا راستہ تبدیل کیا جا رہا ہے جس سے مظفر آباد سٹی سمیت زیریں علاقے میں پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ امریکہ کو صرف اخباری بیانات تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ چینی سامراج اور پاکستان کے خلاف عملی اقدامات کی طرف بڑھنا چاہیے جو خطے کے قدرتی وسائل کی نوآبادکاری کر رہے ہیں۔ جموں کشمیر نیشنل انڈیپنڈنس الائنس (JKNIA) کے چیئرمین محمود کشمیری نے کہا کہ 'جموں اور کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور چین اور پاکستان کو متنازعہ علاقے کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ ہم جموں اور کشمیر کے لوگ سی پیک کے خلاف ہیں۔ ہم عالمی برادری سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ضرورت کی گھڑی میں ان کا ساتھ دے۔ گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے ایک قوم پرست آفاق احمد نے کہا کہ 'پاکستان ہماری آواز کو دبانے کے لیے طاقت کا استعمال کر رہا ہے۔ ہم اپنے علاقے کے جبری قبضے کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ لیکن کوئی عالمی طاقت ہماری نجات کے لیے نہیں آ رہی۔ اب امریکہ نے سی پیک منصوبے کی مخالفت میں آواز بلند کرنا شروع کیا ہے ہم اس اقدام کی تعریف کرتے ہیں۔ ہم تمام عالمی قوتوں بشمول امریکہ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ گلگت کے مجبور لوگوں کی مدد کریں کیونکہ ہم گزشتہ ستر سال سے پاکستان کے جبر کا شکار ہیں'۔

قوم پرستوں کی اس گراوٹ کے علاوہ دیگر معروضی عناصر کی روشنی میں بھی پاکستانی مقبوضہ کشمیر

میں آئندہ سالوں میں قومی آزادی کے نعروں کے گرد کسی بڑی تحریک کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔لیکن گلگت بلتستان میں سی پیک کے خلاف شدید نفرت اور غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ابھی حال ہی میں عوامی ایکشن کمیٹی جانب سے گلگت میں کئی ہڑتالیں اور احتجاج دیکھنے میں آئے ہیں اور کشمیر کی نسبت گلگت میں قومی جبر اور محرومی کے خلاف ردِعمل زیادہ شدت سے بڑھ رہا ہے۔اس سے گزشتہ حکومتوں کی طرف سے دیئے گئے مختلف پیکجز نے بھی گلگت کے حکمران طبقے کی تھوڑی بہت مراعات میں تو اضافہ کیا ہے لیکن عام لوگوں کے حالاتِ زندگی مسلسل بگڑتے جا رہے ہیں۔چند سال قبل گندم پر ملنے والی سبسڈی کے مرکزی حکومت کی طرف سے خاتمے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر روٹی کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف تحریک میں گلگت کے عوام کے انقلابی پوٹینشل کا اظہار ہو چکا ہے۔اس کے بعد سے اب تک کسی نہ کسی شکل میں یہ مزاحمت نہ صرف موجود رہی ہے بلکہ آگے بڑھ رہی ہے۔یہاں کے نوجوان تیزی سے سیاست کی جانب راغب ہو رہے ہیں اور ان تمام تجربات سے اہم نتائج اخذ کر رہے ہیں۔دیگر مظلوم قومیتوں کی طرح یہاں سے بھی جبری گمشدگیوں کا سلسلہ بڑھ رہا ہے جبکہ احتجاج کرنے والوں کے خلاف کاروائیاں کی جا رہی ہیں۔سی پیک کے منصوبوں پر جیسے جیسے کام بڑھے گا ویسے ہی یہاں حکمران طبقے اور ان کی تمام پالیسیوں کے خلاف نفرت کھل کر سامنے آئے گی۔گلگت بلتستان کو الگ صوبہ بنانے کی تجویز کا ذکر بھی وقتاً فوقتاً سنائی دیتا ہے لیکن ایسا کرنے سے پاکستانی ریاست کو کشمیر پر اپنے دیرینہ مؤقف سے پسپائی اختیار کرنا پڑے گی۔امریکہ اور چین اس متنازعہ علاقے میں اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے پاکستانی ریاست پر دباؤ بڑھائیں گے جبکہ ان سامراجی تنازعات کا خمیازہ یہاں کے عوام بھگتیں گے۔اس کے علاوہ ایران اور دیگر مذہبی قوتوں کا دائرۂ اثر یہاں بڑے پیمانے پر موجود ہے جو تضادات کو مزید بھڑکانے کا سبب بنے گا۔سرحد کی دوسری جانب چینی صوبے سنکیانگ میں ترک نسل کے یوغر اکثریت میں ہیں اور ان کا اس جانب آمد و رفت کا رجحان اور کچھ آبادی موجود ہے۔سنکیانگ میں ان پر چینی ریاست کی جانب سے قومی اور مذہبی جبر کیا جا رہا ہے جبکہ اس کیخلاف نفرت کو مختلف طاقتیں اپنے مفادات میں استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔یہ تمام تر صورتحال اس خطے سمیت ملحقہ علاقوں میں عدم استحکام میں اضافہ کرے گی۔اس حوالے سے اگر کوئی قیادت اس عوامی غصے کو طبقاتی بنیادوں پر مجتمع اور مرتکز کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اس کے لداخ سمیت پورے کشمیر کی سیاست پر بھی گہرے اثرات پڑ سکتے ہیں۔

سندھ

گزشتہ چند سالوں میں سندھ کی قوم پرست پارٹیاں بری طرح سیاسی پسپائی کا شکار ہوئی ہیں۔ خاص طور پر بشیر قریشی کی پراسرار موت کے بعد سندھ کی قومی تحریک تقریباً معدوم سی ہوگئی ہے۔ اپنے آخری ایام میں بشیر قریشی نے سندھی قوم پرستی میں دوبارہ روح پھونکنے کی کوششیں بہت تیز کردی تھیں۔ وفات سے چند ماہ قبل اس نے کراچی میں بھرپور طاقت کا مظاہرہ بھی کیا جس میں مختلف ذرائع کی رپورٹس کے مطابق لاکھوں لوگوں نے شرکت کی تھی لیکن سنجیدہ تجزیئے کے مطابق 60 ہزار سے ایک لاکھ کے مابین افراد اس ریلی میں شریک تھے۔ بشیر قریشی کا کراچی کے مہاجروں کی طرف رویہ دیگر سندھ کی قیادتوں کی نسبت قدرے مختلف تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اردو بولنے والے بھی سندھی ہیں اور ان کو بھی سندھ کی قومی تحریک کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ باقی تمام قوم پرستوں کی نسبت ریاست کے لیے زیادہ پریشان کن مؤقف تھا۔ اسی لیے یہ سازشی تھیوری بھی کافی گردش کرتی رہی کہ بشیر قریشی اپنی مقررہ حدود سے تجاوز کر رہا تھا، اسی لیے اسے بڑی کامیاب منصوبہ بندی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا گیا۔ لیکن تب سے اب تک جسقم میں سیاسی پھوٹ کھل کر سامنے آ گئی ہے اور اس کے دو بڑے دھڑے بن چکے ہیں۔ نیاز کالانی اور سنان قریشی الگ الگ دھڑوں کے نمائندے ہیں۔ آنے والے دنوں میں کسی سیاسی پروگرام اور تحرک کی غیر موجودگی میں اس پھوٹ میں کمی آنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ سندھ کے باقی قوم پرستوں کی طرف سے بھی کوئی سیاسی چہل پہل نظر نہیں آ رہی ہے۔ جسمم کے نوجوانوں نے کچھ انفرادی دہشت گردی کی مہم جوئیاں کچھ سال قبل کی تھیں، جس کے بعد ریاست نے اس پر شدید ردِعمل کرتے ہوئے جسمم کے زیادہ تر نوجوانوں کو غائب کر دیا تھا جن میں سے چند کو کچھ عرصے بعد چھوڑ دیا گیا اور وہ سیاست سے توبہ تائب ہو گئے جبکہ کچھ نوجوانوں کی مسخ شدہ لاشیں بھی ملیں۔ مختصر یہ کہ سندھ میں مسلح لڑائی کا طریقہ اپنی ابتدا میں ہی شدید ناکامی سے دوچار ہو گیا۔

اسی سال اچانک سندھ کے نامور سیاستدان رسول بخش پلیجو نے بھی دوبارہ سیاسی میدان میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بیٹے ایاز لطیف پلیجو کو مفاد پرست اور پارٹی نظریات کا مرتد قرار دے کر اپنی پارٹی سے علیحدہ کرنے کا اعلان کر دیا اور اندرون سندھ میں ایک ریلی بھی نکالی جس میں چند سو یا ہزار خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ رسول بخش کی اس اچانک سیاسی گرمجوشی کے پیچھے بھی کسی حد تک سی پیک کا ہی عمل دخل تھا اور موصوف نے سندھ کے ساتھ ہونے

والی ناانصافیوں کے ازالے کے طور پر سی پیک میں سندھ کے لیے بڑے حصے کی بات کی اور ساتھ سندھی زبان کو قومی زبان کا درجہ دلوانے کی بات کی۔ ان کے بیٹے نے بھی ابھی حال ہی میں سی پیک کی تکمیل کے لیے اپنی ہر ممکن خدمات پیش کر دی ہیں۔ بظاہر ذاتی چپقلشوں کے علاوہ دونوں کے سیاسی پروگرام میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آیا۔ اور اس کے علاوہ جو سندھ کے عوام کے دیگر مسائل ہیں، ان پر پلیجو صاحب نے کوئی انقلابی پروگرام نہیں دیا اور ان کے بعد ان کی پارٹی میں کوئی اور ایسی قیادت بھی دکھائی نہیں دے رہی جو آئندہ برسوں میں سندھ کی قومی تحریک میں بڑے پیمانے کی سیاسی اتھل پتھل کو جنم دے سکے۔ سندھ کے قوم پرستوں کے لیے ایک سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ پیپلز پارٹی جو ماضی میں وفاق کی پارٹی ہوا کرتی تھی لیکن سندھ میں اس کا بڑا ووٹ بینک موجود تھا۔ مگر گزشتہ چند سالوں سے پیپلز پارٹی صرف سندھ کی پارٹی بن کر سامنے آئی ہے اور ایم کیو ایم کے ساتھ اپنی حصہ داری کی لڑائیوں میں پیپلز پارٹی نے 'مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں' کے نعرے کو کھل کر استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو تھوڑا بہت قوم پرست سیاست کا خلا موجود تھا اس کو بھی پیپلز پارٹی نے کیش کروالیا ہے۔

لیکن سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ایسی کیفیت میں جب سندھ کی قومی تحریک اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی ہے اور قوم پرستوں کی سماجی حمایت ہی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے، قوم پرستوں کے خلاف سندھ کی تاریخ کا سب سے بڑا آپریشن کیا جا رہا ہے۔ بچے کھچے قوم پرستوں کو اٹھا کر یا ڈرا کر انہیں قومی سیاست سے استعفے دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی رپورٹ کے مطابق رواں سال جنوری سے اگست کے مابین سندھ سے 110 لوگوں کو گمشدہ کیا گیا۔ 2016ء میں اس طرح کے صرف چھ واقعات ہوئے تھے لیکن وہ تمام چھ افراد آج تک لاپتہ ہیں۔ ایک دوسری تنظیم سندھ ہیومن رائٹس ڈیفنڈر (SHRD) کے مطابق اس سال گم ہونے والے سندھیوں کی تعداد 123 ہے جن میں سے صرف 9 واپس آئے ہیں۔ یہ سب حیران کن ہے۔ نامور کالم نگار وسعت اللہ کا اس حوالے سے یہ کہنا ہے کہ ریاست کے سندھ میں ردِعمل کی کوئی بھی وجوہات سمجھ سے باہر ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سی پیک اس کی ایک وجہ ہے اور ریاست نے سی پیک کے ناقدین کی زبان ہر قیمت پر بند کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے یا پھر چین کی طرف سے اس قسم کے اقدامات دیگر شرائط کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ سندھ میں گیس نکالنے والے منصوبوں پر زیادہ تر چینی کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ اس حوالے سے مغربی اور

امریکی سامراجی چین کی سرمایہ کاری کو نقصان پہنچانے کے لیے سندھ کے قوم پرستوں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کو اٹھایا جا رہا ہے جن کے بیرونِ ملک رابطے ہیں یا جن کو باہر سے گزشتہ کچھ عرصے میں بڑی رقوم بھیجی گئی ہیں۔ خاص طور پر بھارت سے کسی بھی قسم کے تعلق کے شبے میں کئی لوگوں کو اٹھایا گیا ہے۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت ہے اور اس نے ان تمام اقدامات پر مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ پیپلز پارٹی خود ان اقدامات میں ملوث ہے اور اپنے سیاسی دشمنوں کو اس کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ریاست کے کچھ لوگ خود سندھ میں قومی مسئلے کو ہوا دینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کیونکہ اب پیپلز پارٹی مکمل طور پر ریاستی بی ٹیم میں تبدیل ہو چکی ہے، اس لیے کسی نہ کسی سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جس کے ذریعے عوامی غم و غصے کو زائل کیا جا سکے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ریاست کی بوکھلاہٹ ہی اسے اس طرح کے اقدامات کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ لیکن ان انتہائی اقدامات سے عام لوگوں میں غم و غصہ بڑھ رہا ہے۔ ابھی تو خوف کی فضا کے باعث اس کا اظہار نہیں ہو پا رہا لیکن آنے والے دنوں میں یہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور اپنا اظہار کرے گا۔

خیبر پختونخوا

تاریخی طور پر اگر دیکھا جائے تو پشتون نیشنلزم بلوچ نیشنلزم کی حد تک ریڈیکل کردار کا حامل نہیں رہا ہے۔ یعنی مکمل آزادی یا علیحدگی کے مطالبے کی بجائے پشتون قوم پرستوں نے مختلف ادوار میں پنجابی استعمار کے ساتھ اتحاد اور حکومتیں بنا کر صوبائی خودمختاری کی حد تک ہی بات کی ہے۔ جبکہ ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ پشتون قوم کے دیگر بنیادی مسائل پر انکا موقف کبھی بھی واضح نہیں رہا ہے۔ یوں کہہ لیں تو غلط نہ ہوگا کہ قومی تحریکوں میں جو سب سے بڑی اور واشگاف غداری پشتون قیادت نے کی ہے اس کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ پشتون قیادت افغانستان میں انقلابِ ثور کی ناکامی کے بعد مکمل طور پر امریکی سامراج کی گماشتگی کی طرف چلی گئی تھی۔ آج بھی اے این پی کی قیادت واضح طور پر امریکی بلاک کا حصہ ہے۔ وہ اپنی سیاسی میٹنگوں اور عوامی جلسوں میں برملا کہتے ہیں کہ طالبانائزیشن کا راستہ روکنے کے لیے ہمارے پاس امریکہ کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ اسی مؤقف کی وجہ سے ان کی قیادت اور کارکنوں کو دہشت گردی کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ بلکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شاید اے این پی سے زیادہ کسی نے بھی جانی نقصان

برداشت نہ کیا ہو۔ان دہشت گردی کے حملوں کی آڑ میں پاکستانی ریاست پشتون قیادت کو دوبارہ امریکیوں کی بجائے اپنے براہِ راست کنٹرول میں لانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔اسی لیے ان کے متبادل کے طور پر انہوں نے خیبر پختونخواہ کو عمران خان کے حوالے کر دیا۔حقیقت یہ ہے کہ سابقہ اقتدار کے دوران اے این پی کی زیادہ تر قیادت نے لوٹ مار کی انتہا کر دی تھی اور ایسے ماحول میں قوم پرستی سمیت کوئی بھی نظریہ پھلنے پھولنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔اقتدار کے دنوں میں نظریاتی لوگوں کی مکمل حوصلہ شکنی کی گئی جبکہ فصلی بٹیروں نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ اسی لیے نئے سیاسی کارکن باچا خان یا کسی بھی دوسرے نظریات سے مکمل طور پر عاری ہیں۔حتیٰ کہ مذہبی بنیاد پرست بھی اس وقت اے این پی کی صفوں میں گھس چکے ہیں جس کا واضح اظہار مشال خان کے قتل میں اے این پی کے کارکنوں کی قائدانہ مداخلت سے لگایا جا سکتا ہے۔

اے این پی کے ساتھ ساتھ پختونخواہ ملی عوامی پارٹی شدید ٹوٹ پھوٹ اور تناؤ کا شکار ہے۔ موجودہ حکومت میں حصہ داری کی وجہ سے پارٹی کے اندر بھی مال کے اوپر لڑائی موجود ہے۔یہ خالصتاً ذاتی مفادات کی لڑائی ہے جسکی کوئی نظریاتی بنیادیں نہیں ہیں۔جبکہ دوسری طرف پارٹی ورکرز کی فرسٹریشن روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اپنی قیادت سے مایوس ہو چکے ہیں۔پارٹی قیادت نے کسی حد تک افغان مہاجرین کی جبری بے دخلی کے مسئلے پر یا فاٹا کے پختونخواہ کے ساتھ انضمام کے معاملے پر سیاسی نعرے بازی کے ذریعے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال رکھنے کی کوشش کی ہے مگر اس میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔فاٹا کے لوگوں کے مسائل بھی انضمام سے حل ہونے والے نہیں ہیں۔اس ریاست کے ساتھ رہنے والے دیگر صوبوں کے مسائل میں بھی گزشتہ کئی سالوں سے کئی گنا اضافہ ہی ہوا ہے۔لیکن انضمام سے فاٹا کے لوگوں کے سیاسی معمول میں رد و بدل ہونے کے باعث سیاسی شعور پر مثبت اثرات پڑیں گے اور ریاست کے لیے بھی مخصوص سیاسی حالات کی آڑ میں فاٹا کو اپنے پسندیدہ 'ریاستی اثاثوں' کی آماجگاہ کے طور پر استعمال کرنا اتنا آسان نہیں رہے گا۔اسی لیے کچھ ریاستی عناصر انضمام کی راہ میں روڑے اٹکا کر تاخیری حربے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اگرچہ مارکسی ہر اس آئینی یا قانونی اصلاحات کی حمایت کرتے ہیں جس سے عوام کی جڑت میں اضافہ ہو لیکن جیسے اس سے قبل صوبہ سرحد کا نام بدل کر پختونخواہ رکھنے سے صوبے کی عوام کی زندگیوں میں کوئی بہتری نہیں لائی جا سکی ہے ویسے ہی فاٹا کے لوگوں کو بھی انضمام سے کوئی بہت زیادہ توقعات نہیں لگانی چاہئیں۔پشتونوں نے گزشتہ دو تین

دہائیوں میں ملاؤں سمیت تمام سیاسی پارٹیوں کو آزمالیا ہے۔ابھی وہ عمران خان کے مخصوص دائیں بازو کے پاپولزم کا تجربہ بھی کر رہے ہیں۔اس حکومتی دور میں لوگوں کے معیارِ زندگی میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور غربت کی شرح بھی بلوچستان کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ایسے میں نئی انقلابی قیادت کا خلا پشتو نخواہ میں شاید سب سے زیادہ ہے۔

یوں پاکستان میں قوم پرستی کا عمومی تناظر بنایا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کی داخلی لڑائیوں اور سامراجی پراکسیوں نے مکمل طور پر قومی سیاست کی جگہ لے لی ہے۔قومی سیاست کے مروجہ دھارے میں ترقی پسند عنصر یکسر معدوم ہو چکا ہے۔نوجوانوں کی نئی نسل کافی حد تک مروجہ قیادتوں، پارٹیوں اور تنظیموں کے پراکسیوں کا حصہ ہونے کے عمل کو سمجھ رہے ہیں اور اس سے اہم سیاسی نتائج اخذ کر رہے ہیں۔ابھی ان کی اکثریت براہِ راست سیاسی عمل کا حصہ نہیں ہے لیکن ان کی اس قوم پرستی کی سیاست پر گہری نظر ہے۔وہ اس ریاست اور اس کے تمام اداروں سے مکمل طور پر مایوس اور متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ایسے میں اس ریاست کے وجود کا سوال بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ہر کوئی یہ سوال کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ کیا یہ ملک ان حالات میں قائم رہ سکے گا یا اس کے حصے بخرے ہونا ناگزیر ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ریاست کے ادارے کمزور ہوئے ہیں اور پراکسیوں کے ذریعے امریکی سامراج پاکستانی ریاست پر مزید دباؤ بڑھا رہا ہے جس سے اداروں کی ٹوٹ پھوٹ میں مزید اضافہ ہوگا۔لیکن بلوچستان کی ایک الگ قومی ریاست کو چلانا خود امریکہ کے لیے بھی اتنا آسان نہیں ہوگا۔اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ریاست پر دباؤ بڑھا کر ہی کام چلایا جائے۔اس ریاست کو ایک منظم، مستعد اور مرتکز مزدور تحریک کی کامیابی کے ذریعے ہی اس کے منطقی انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے جو برِ صغیر کی رضا کارانہ سوشلسٹ فیڈریشن کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگی۔اس فیڈریشن میں الحاق کے لیے کسی بھی قوم پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا بلکہ ان کے حقِ خود ارادیت اور حقِ علیحدگی کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں اپنی الگ ریاست بنانے کا مکمل اختیار دیا جائے گا۔لیکن بھوک، بیروزگاری اور استحصال سے پاک معاشرے میں مفت تعلیم، علاج، رہائش اور ٹرانسپورٹ جیسی بہت سی ایسی ترغیبیں ہونگی جو اس رضا کارانہ فیڈریشن میں مقناطیسی کشش پیدا کر کے اس کے پھیلاؤ اور استحکام کا موجب بنیں گی۔

6۔سیاسی بیگانگی سے طبقاتی جنگ کی جانب سفر

لینن نے کہا تھا سیاست مجتمع شدہ معیشت ہوتی ہے۔ پاکستان کی معیشت کا جو تناظر ہم نے بنایا ہے، اس کو اگر مجتمع کر لیا جائے تو سوائے انارکی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جبریت پسند یہ سمجھتے ہیں کہ جو اس وقت ہے، اس کے علاوہ یا اس سے بہتر کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور مستقبل میں صرف اور صرف وہی ہوگا جس کے شواہد اور امکانات سماجی معمولات کی سطح پر دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن جدلیاتی مادیت پسند تاریخ کے 'معینہ' ہونے پر یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ مستقبل حال کے اندر بہت سے امکانات کے باہمی تعلق کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ یہ امکانات ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ نہیں ہوتے کہ ان کی واضح حد بندی کی جا سکے کہ یہاں سے یہ امکان ختم ہوتا ہے اور دوسرا شروع ہو جاتا ہے بلکہ اس کے بالکل الٹ یہ امکانات ایک دوسرے میں بری طرح مدغم ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کو کسی بھی لمحے مکمل طور پر الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جس طرح سہل پسند تجربیت پسند انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سطح پر ان میں سے کوئی ایک امکان ہی غالب نظر آ رہا ہوتا ہے اور باقی امکانات پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ یہ امکان خود کوئی مابعد الطبیعاتی شے نہیں ہوتی بلکہ تمام معروضی عوامل کے مابین ایک مخصوص تعلق ہی ہوتا ہے جو آنے والے وقت کی تشکیل کی ایک مخصوص صورت کو جنم دیتا ہے۔ لیکن انسانی سماج انتہائی پیچیدہ کُل ہوتا ہے جس میں بیک وقت کئی امکانات پائے جاتے ہیں اور موضوعی قوتیں ان پر اثر انداز ہو کر تاریخی عمل کو آگے بڑھاتی ہیں۔ یعنی ایک خاص وقت میں معروضی عوامل کے مابین تعلق کسی ایک خاص امکان کو سماجی سطح پر نمودار کرتا ہے۔ ظاہریت پسند اسے واحد ممکنہ شکل سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ معروضی عوامل کے تعلق میں کوئی بھی معیاری تبدیلی آنے والے واقعات کی شکل کو فیصلہ کن انداز میں بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اور پھر وہی موضوعی قوتیں اس غیر متوقع مستقبل (جو کہ اب حال بن چکا ہوتا ہے) کی تشکیل و تکمیل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں جو سطح کے نیچے موجود امکانات پر بھی گہری نظر رکھتی ہوں۔ حقیقت اتنی ہلکی نہیں ہوتی کہ خود تیر کر سطح پر آ جائے بلکہ وہ ٹھوس اور وزنی ہوتی ہے اور

اسے امکانات کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر تلاش کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اس وقت پاکستانی معیشت اور سماج کی صورتحال مستقبل میں سیاسی انتشار کی طرف جاتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے مگر یہ انتشار انسانیت کا مقدر نہیں ہے جسے ہر قیمت پر وقوع پذیر ہونا ہو بلکہ انسانیت ان امکانات کا شعور حاصل کر کے انہیں بدل کر سیاسی افق کی بالائی پرت کے نیچے چھپے روشن اور سرخرو مستقبل کے امکانات کو حقیقت کا روپ دے سکتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ برسوں سے چلا آ رہا سٹیٹس کو ٹوٹ گیا ہے اور نئی سیاسی شکلیں نمودار ہو رہی ہیں لیکن سٹیٹس کو کہ نمائندہ لوگ جن کے مفادات سماج اور سیاست کی مروجہ حالت سے وابستہ ہیں ان کے پاؤں کے تلے سے زمین سرک رہی ہے اور انہیں سامنے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ یہ پہلی دفعہ نہیں ہو رہا جب بھی سماج معیاری تبدیلیوں کے عمل سے گزرتا ہے تو رائج الوقت سیاسی و سماجی لوگ اور ادارے یہی چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اوہو ہو وہ دیکھو 'قیامت' آ رہی ہے۔ جو سچ پوچھو تو ان کے لیے یہ قیامت ہی ہوتی ہے۔ لیکن سائنس کی زبان میں اسے 'بحران' یا 'عبوری' کیفیت کہا جاتا ہے۔ اب یہ کس نئی سماجی و سیاسی شکل پر منتج ہوتا ہے اس کا فیصلہ زندہ سماجی قوتوں کے باہمی ٹکراؤ سے ہوگا۔

ہچکیاں لیتی ہوئی مذہبی سیاست

سب سے زیادہ جس بات کا پاکستان میں رونا رویا جاتا ہے اور جس عنصر کو انقلاب کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ مذہبی عنصر ہے۔ 'یہ تو اسلامی معاشرہ ہے، یہاں انقلاب کیسے آئے گا'؟ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب عام مزدور اور کسان نہیں بلکہ پڑھے لکھے دانشور قسم کے لوگ اس طرح کی گفتگو کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی پڑھے لکھے لوگوں کو یہ ذہنی خبط ہوتا ہے کہ لوگوں کو مذہب سے دور کرنا ہی ایک انقلابی قدم ہے۔ کچھ پیشہ ور لبرل خواتین و حضرات کا تو کام ہی یہ رہ گیا ہے کہ وہ لوگوں کو ہر وقت داعش اور طالبان جیسی قوتوں سے ڈراتے رہتے ہیں۔ اصل میں ان لبرلز کا قبلہ اور کعبہ امریکہ بہادر ہے جو یہاں اپنی سامراجی گرفت کو مضبوط کرنے کے جواز کے طور پر ان مذہبی قوتوں کو ایک ہوّا بنا کر پیش کرتا ہے۔ یعنی اگر امریکہ کا افغانستان اور پاکستان سے عمل دخل ختم کر دیا جائے تو یہاں پر داعش یا طالبان قبضہ کر لیں گے اور پاکستان کے ایٹمی ہتھیار ان جنونیوں کے ہاتھ لگ جائیں گے اور اس کے بعد یہ پوری دنیا کو تباہ کر دیں گے اور قیامت آ جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ سب سے اہم اور بنیادی غلطی اس ساری ہاؤ ہو میں یہ

نہیں کہ وہ طالبان کی اوپر سے (ایک کُو کی شکل میں) ریاست پر قبضہ کرنے کی بات کرتے ہیں، یہ تو ایک مخصوص صورتحال میں شاید ممکن بھی ہے، جس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ سب لوگ یا آبادی کی واضح اکثریت مذہبی ہوتی جا رہی ہے، بنیاد پرستوں کی سماجی حمایت میں اضافہ ہو رہا ہے اور بنیاد پرست عوامی طاقت کے بلبوتے پر ریاست پر براجمان ہو کر سماج کو تباہی کی طرف لے جائیں گے۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت پر یقین رکھنے والا کوئی بھی شخص ان سیاسی اور ریاستی عناصر کے خلاف جدوجہد کرے گا اور ان کے خلاف لوگوں کو اکسائے گا جو مذہبی بنیاد پرستوں کو ریاست پر قبضہ کرنے کے موافق حالات مہیا کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسری صورت پر یقین رکھنے والے شخص یا دانشور کی نفرت، حقارت اور بغاوت ہی عام انسانوں سے ہوتی ہے کیونکہ وہ ان کو جاہل اور بنیاد پرست سمجھ کر ریاست کے ایک دھڑے کو ان کے خلاف حرکت میں آنے پر اکساتا رہے گا یعنی وہ حکمران طبقات کی دلالی کرنے پر مجبور ہوگا۔ ایسی مخلوق کا نام لبرل ہے اور یہ حقیقت میں اتنے ہی بنیاد پرست ہوتے ہیں جتنا کہ ایک مذہبی شخص ہو سکتا ہے بلکہ ان کے لیے لبرل فاشزم کی اصطلاح استعمال کی جائے تو غلط نہ ہوگا۔

حقیقت میں پاکستان کی ستر سالہ تاریخ میں اسلامی پارٹیوں کی کبھی بھی سماجی حمایت نہیں رہی ہے۔ ضیاء الباطل نے امریکی آقاؤں کی ایما پر نصاب اور آئین میں تبدیلیاں کر کے اوپر سے سماج پر مذہبی بنیاد پرستی کو مسلط کیا مگر آج چوتھی دہائی اختتام کو پہنچنے والی ہے اور نصاب اور آئین میں کوئی تبدیلی نہ ہونے کے باوجود ملاؤں کی سماجی حمایت بڑھنے کی بجائے کم ہوئی ہے۔ ابھی ن لیگ کی طرف سے ختمِ نبوت کے حلف نامے کے ختم ہونے کے حوالے سے ملاؤں نے بہت شور مچایا لیکن سماج کی ایک باریک سی پرت کو بھی متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے لہذا میڈیا کو ہی ان کی اس جعلی تحریک کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنا پڑا۔ اسی شور شرابے میں پچھلے عرصے میں ایک نئی مذہبی پارٹی لبیک یا رسول اللہ کے نام سے بنائی گئی ہے جن کا ہیرو سلمان تاثیر کا قاتل ممتاز قادری ہے۔ آج کل بھی یہ چند درجن مذہبی جنونی اسلام آباد میں سڑک بلاک کر کے بیٹھے ہیں حالانکہ ان کا شو بری طرح فلاپ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے ممتاز قادری کی پھانسی سے پہلے بھی کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ملک میں قیامت برپا ہو جائے گی اور قادری کو پھانسی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ چند ہزار لوگ ہی قادری کی پھانسی کے وقت سڑکوں پر سراپا احتجاج نظر آئے۔ جبکہ دوسری

طرف ہم نے ان مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں ایک ترقی پسند نوجوان مشال خان کے قتل کے خلاف سماج میں اضطراب اور غم و غصے کی شدید لہر کو ابھرتے دیکھا۔ وہ لوگ جو اپنی کرپشن اور لوٹ مار کے خلاف اٹھنے والی اس نحیف سی آواز کو دبانے کے لیے مذہب کی اس آزمودہ وحشت کے استعمال کو آسان اور محفوظ ترین راستہ سمجھ رہے تھے ان کو منہ کی کھانی پڑی اور رجعتیت اور اسلامی جنونیوں کے محبوب ترین اور غیر متنازعہ سمجھے جانے والے نوٹنکی ملاں طارق جمیل کو بھی سماج کا ردِعمل دیکھتے ہوئے مشال خان کو شہید قرار دینا پڑا۔ اسی طرح ان سے پہلے ہی کراچی کے مذہبی مافیا کے اہم ستون مفتی نعیم کو بھی اسی طرح کے بیانات جاری کرنا پڑے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اندھا یقین جو اس مذہبی اشرافیہ کی سب سے بڑی طاقت تھا، اب ہچکولے کھا رہا ہے۔ 'سوال' جو مذہبی طرزِ فکر کے لیے زہرِ قاتل ہے سماجی نفسیات اور شعور میں اپنی جڑیں بنانے کی طرف جا رہا ہے۔ ہر وقت بڑھتی ہوئی عدم برداشت کی دہائی دینے والے قنوطیے یہ سب دیکھنے اور تسلیم کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ حالانکہ عدم برداشت واقعی بڑھ رہا ہے لیکن اس کا تعلق انسانوں کے وقتی اور لحاتی ردِعمل سے ہوتا ہے جبکہ سوال اٹھانے اور 'شک' کرنے کی روایت معاشرے کے عمومی ارتقائی سفر میں ایک اہم پیشرفت ہے۔

جماعت اسلامی جو ایک وقت میں 'سیاسی اسلام' کی چیمپین ہوا کرتی تھی آج اپنی بقا کی جدوجہد میں عملیت پسندی کی کسی بھی انتہا تک جانے کے باوجود سیاسی افق سے مکمل طور پر غائب ہونے کے خطرے سے دوچار ہے۔ روایتی طور پر پاکستانی سیاست میں دو ہی اسلامی پارٹیاں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں جن میں ایک جماعت اسلامی اور دوسری جمعیت علمائے اسلام ہے۔ جماعت اسلامی کی سماجی حمایت زیادہ تر شہری درمیانے طبقے میں تھی جبکہ پسماندہ علاقوں کے دیہی درمیانے طبقے کے کچھ حصے پر جمعیت کا غلبہ ہوا کرتا تھا۔ مگر آج کل دونوں کے پاؤں نیچے سے ان کی سماجی حمایت تیزی سے سرک رہی ہے۔ دونوں پارٹیاں حکومت میں ہیں۔ ایک مرکز میں ن لیگ کی اتحادی جبکہ دوسری صوبے میں تحریکِ انصاف کے اقتدار میں حصہ دار ہے۔ حال ہی میں لاہور میں حلقہ NA-120 میں میاں نواز شریف کی نا اہلی کے بعد ضمنی انتخابات ہوئے۔ ان حلقوں میں ماضی میں جماعت اسلامی کا اوسطاً 10 ہزار ووٹ ہوا کرتا تھا، اس ضمنی انتخاب میں جماعت اسلامی کے صرف 500 ووٹوں نے اکثر سیاسی حلقوں کو فرطِ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ شہری مڈل کلاس کے بڑے حلقے میں جماعت اسلامی کی یہ چشم کشا شکست پارٹی کے مستقبل پر بہت بڑ

اسوالیہ نشان ہے۔ دوسری طرف جمعیت کی حمایت بھی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ کم ہو رہی ہے۔ اصل میں یہ دونوں پارٹیاں جس سیاسی نظریے کی نمائندہ ہیں اس کی بنیادیں بہت کھوکھلی ہو چکی ہیں اور جدید موبائل اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کے استعمال نے سوسائٹی کو اور خاص طور پر مڈل کلاس کو جوان دونوں پارٹیوں کو سماجی آکسیجن مہیا کرتی تھی، مغرب زدہ جدیدیت کے جھانسے میں الجھا دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معیشت کا جن ان کے ہر خواب کو روندتا جا رہا ہے مگر ایک آس ہے جو درمیانے طبقے کو 'ٹرک کی بتی' کے پیچھے لگا کر اَن دیکھے راستوں کی طرف لیے جا رہی ہے۔

کچھ لوگ NA-120 کے ضمنی انتخاب میں نئی مذہبی پارٹیوں لبیک یا رسول اللہ اور ملی مسلم لیگ جو کہ جماعت الدعوۃ کا جمہوری ورژن ہے، کو پڑنے والے ووٹوں کی بنیاد پر یہ دلیل دے رہے ہیں کہ دیکھیں جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام کی حمایت اگر کم ہو رہی ہے تو ان سے بھی زیادہ کٹر بنیاد پرست فرقہ پرور تنظیمیں اپنی سماجی حمایت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ اول تو جن نتائج کی بنیاد پر یہ دلیل دی جا رہی ہے وہ جھوٹے اور جعلی ہیں۔ ان پارٹیوں کا نصف سے زیادہ ووٹ انسانوں کی بجائے 'فرشتوں' نے کاسٹ کیا ہے۔ لیکن اگر ہم ان نتائج کو درست بھی مان لیں تو یہ کل کاسٹ ہونے والے ووٹوں کا 11 فیصد بتایا جا رہا ہے لیکن ٹرن آؤٹ سرکاری اعلان کے مطابق بھی 40 فیصد کے لگ بھگ رہا ہے۔ جب کہ ہزاروں ووٹ نادرا کی رجسٹریشن کے ریکارڈ کی وجہ سے بھی فہرست میں شامل نہیں تھے۔ اس لیے ان دو پارٹیوں کے حاصل کردہ ووٹ حلقے کے کل ووٹوں کا 4 یا 5 فیصد ہی بنتے ہیں۔ اور اگر فرشتوں کے ووٹ نکال دیئے جائیں تو شاید یہ دو فیصد بھی نہ بنیں۔ دوسری سب سے اہم بات اس ضمنی الیکشن میں ملی مسلم لیگ کی اچانک آمد تھی چونکہ یہ ایک مخصوص فرقے یعنی اہلحدیث فرقے کی جماعت تھی جسے خاص طور پر اسٹیبلشمنٹ کے رجعتی ترین دھڑے نے اس لیے سیاسی دھارے کا حصہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ یہ کچھ عرصے سے بیروزگار ہونے کے باعث اپنے ریاستی پروردگاروں کے لیے وبالِ جان بن چکے ہیں۔ یہ درحقیقت خفیہ اداروں کے حلق میں پھنسا وہ کانٹا ہیں جنہیں نہ تو اگلا جا سکتا ہے اور نہ نگلا جا سکتا ہے۔ امریکہ کے دباؤ کے خلاف ایک ردِعمل کے طور پر ان انتخابات میں ان کی اچانک ظہور پذیری کے باعث ان کے مخالف فرقے یعنی بریلویت کے سرغنوں کا ردِعمل کے طور پر زیادہ فعال ہو جانا ناگزیر تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے حمایت یافتہ ہر ایک شخص کو متحرک کرنے کے باوجود بھی بس اتنے ہی ووٹ حاصل کیے۔ ان نتائج کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور اس حلقے کے نتائج کی بنیاد

پر آئندہ عام انتخابات میں ان دونوں پارٹیوں سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنا انتہائی ڈرے ہوئے نام نہاد لبرل ذہن کے خبط کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ان کے علاوہ فرقہ وارانہ سیاست میں پاکستان کے دونوں روایتی حریف سنی اور شیعہ سیاسی پارٹیاں بھی گزشتہ دو دہائیوں میں پاکستان میں ہونے والی ریاستی حمایت یافتہ دہشت گردی اور پھر نوٹنکی ریاست کے اس کے خلاف آپریشن کے باعث بری طرح ایکسپوز ہو چکی ہیں۔ کوئٹہ میں معصوم ہزارہ کے قتل پر صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ سنی آبادی کی بڑی اکثریت کے دل خون کے آنسو روتے ہیں۔ حقیقت میں ریاست کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ فرقہ پرور جماعتیں عوام کے اندر اپنی جڑیں بنانے میں بری طرح ناکام ہوئی ہیں۔ نیچے سے سماجی حمایت اگرچہ مسلسل گر رہی ہے مگر ریاستی اداروں کو آج پہلے سے بھی زیادہ ان پارٹیوں کی ضرورت ہے۔ یعنی اوپر سے سماج پر ان کو مسلط کرنے کی کوششیں نہ صرف بڑھیں گی بلکہ ان کی شدت میں بھی اضافہ ہوگا۔ خاص طور پر گزشتہ تین چار دہائیوں میں ریاست نے جو پیشہ ور مذہبی جنونی تیار کیے ہیں، اور جن کا ایک بڑا حصہ ماضی میں افغانستان اور کشمیر برآمد کیا جاتا تھا، اب برآمدات کے ان دونوں مقامات کی طرف سے طلب میں بھی کمی آئی ہے اور ان کی ترسیل کے حالات بھی مشکل ہوئے ہیں۔ لیکن گزشتہ عرصے میں مشرقِ وسطیٰ میں ان کی مانگ میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے ان دہشت گردوں کی بڑی تعداد کو وہاں برآمد کیا گیا۔ لیکن اسی عمل نے اس خطے میں داعش کو رابطے مستحکم کرنے میں مدد دی اور وہاں سے واپسی پر کچھ لوگوں نے ریاست کے ایک دھڑے کی خدمات حاصل کرتے ہوئے یہاں پر داعش کی بنیادیں رکھیں۔ اسی عمل میں زیادہ مال کے لالچ میں بہت سے لوگوں نے ریاست کے دھڑوں کی لڑائی میں ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی اور وہ مارے گئے۔ عوام کے سامنے یہ لوگ بری طرح ننگے ہو چکے ہیں۔ ماضی میں طالبان کو صرف سنی فرقے کی نمائندہ تنظیم سمجھا جاتا تھا لیکن اب افغانستان سے ایسی رپورٹس موصول ہوئی ہیں کہ طالبان کے بڑے دھڑے کے ایران سے بھی بڑے قریبی تعلقات ہیں۔ یوں بنیادی طور پر داعش، طالبان، جنداللہ اور احرار وغیرہ سب کسی نہ کسی علاقائی طاقت کی پراکسیاں ہیں۔ ماضی میں سعودی عرب ہی مسلح اور سیاسی مذہبی تنظیموں کا اہم فنانسر اور پروردگار ہوا کرتا تھا یا اس کے ردِعمل میں ایرانی یہاں مداخلت کرتے تھے مگر اب قطر، ترکی اور حتیٰ کہ چین اور روس بھی اسلامی بنیاد پرستوں میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں تاکہ خطے میں اپنے مفادات کو تقویت دی جا سکے۔ طالبان

اور داعش وغیرہ کوئی منظّم اکائیاں نہیں ہیں بلکہ وہ مذہبی چھتریاں ہیں جن کو مختلف مذہبی گروپ اپنی اپنی قیمت لگوانے اور بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن گزشتہ کچھ عرصے میں ریاست کے لیے ان گروپوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

ریاست کا ایک حصہ ان کو مکمل طور پر بوجھ سمجھتا ہے اور وہ امریکہ اور انڈیا کے ساتھ اچھے تعلقات کا خواہاں ہے تاکہ ریجن میں تجارت بھی بڑھائی جا سکے مگر ریاست کے دوسرے حصے کی بقا کا انحصار ہی ان مذہبی جنونیوں پر ہے لیکن اس دھڑے کے لیے بھی ان دہشت گرد گروپوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ زیادہ مال کے لیے کسی کو بھی اپنی حمایت فروخت کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ ناسور اس نظام اور ریاست کے رہتے تک مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وقفوں وقفوں سے دہشت گردی کے واقعات بھی ہوتے رہیں گے مگر اس لڑائی کے بے قابو ہو جانے کی صورت میں بھی ان جنونیوں کے ریاست پر قابض ہو جانے کا کوئی تناظر موجود نہیں ہے، کیونکہ پاکستان میں آبادی کی اکثریت تو درکنار ایک خاطر خواہ اقلیت بھی ان جنونیوں کی عقل دشمن اور انسانیت سوز روایات کے لیے نرم گوشہ نہیں رکھتی۔ افغانستان اور عراق و شام میں ان جنونیوں کے جرائم ابھی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر عراق و شام میں ابھی حال ہی میں داعش کے جانوروں نے معصوم خواتین و حضرات کو زندہ جلانے سے لے کر عورتوں کی منڈیاں لگانے تک جو کچھ کیا ہے وہ پاکستان کی نوجوان نسل کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہیں۔ آبادی کی سماجی طور پر پچھڑی ہوئی پسماندہ ترین بہت ہی معمولی سی پرت ہی ان جنونیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ نظام کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے کے لیے کبھی کبھار یہ کہہ دیتے ہیں کہ 'خمینی یا ملا عمر ہی آ جائیں تو شاید کچھ بہتری آ جائے' لیکن ان مایوس کن الفاظ میں درحقیقت مروجہ سیٹ اپ سے نفرت ہی ایک بنیادی اور مستقل عنصر ہوتا ہے اور اس کو جب کوئی اظہار کا مناسب وسیلہ نہیں مل پاتا تو وہ اس طرح کی فرسٹریشن میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ حقیقت میں پیشہ ور ملا بھی اب تو 'لبرل' لائف سٹائل کو ہی پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر پاکستان کا محنت کش طبقہ آنے والے عشروں میں طاقت حاصل کرنے کی متعدد بڑی کوششوں اور انقلابات میں کامیابی حاصل نہیں کر پاتا تو ایسی صورت میں یہ جنونی طاقت کے خلا کو پر کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

سعودی عرب کی معیشت اور ریاست کا حالیہ بحران پاکستان میں ان مذہبی جنونیوں اور ان کے ریاستی پروردگاروں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ ماضی میں جو ہر گلی، محلے اور چھوٹے چھوٹے

دیہاتوں میں بھی بڑی بڑی اور عالیشان مساجد اور مدرسے تعمیر کیے جاتے تھے، ان میں جہاں ایک طرف ریاستی اداروں کے 'کالے دھن' کی بڑی سرمایہ کاری ہوتی تھی وہاں درمیانے طبقے کے یا سرمایہ داروں کے لوٹ کے مال کا بھی بڑا حصہ ہوتا تھا جو اس لوٹ کے مال سے 'فی سبیل اللہ' کچھ خرچ کر کے اس میں برکت اور پاکیزگی کی غرض سے ان مذہبی جنونیوں کی پیداوار کرنے والے کارخانوں کو چندے اور عطیات وغیرہ دیتے تھے۔ دوسری طرف سعودی عرب سے ملنے والے 'مقدس' ہدیے نہ صرف ان بلند و بالا اور عالیشان مساجد اور مدرسوں کی تعمیر و مرمت بلکہ ان کو چلانے والے ملاؤں اور ان کے خاندانوں کی کفالت کا بڑا ذریعہ بھی تھے۔ اور پھر ان کی پروردہ ریاست کی تیل کی فوجی ضروریات بھی سعودی شہزادے ہی پوری کرتے تھے۔ مگر اب عالمی بحران کے باعث سعودی معیشت کے تیل پر انحصار کو کم کرنے کی ضرورت نے سعودی ریاست کو بہت بڑے بحران کا شکار کر دیا ہے۔ محمد بن سلمان کا طاقت پر پراسرار طریقے سے قابض ہو جانا برسوں سے چلی آ رہی ناگزیر معاشی ضرورت کا سیاسی اظہار ہے۔ اور اب معیشت کی اس ٹرانسفارمیشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک بہت بڑا آپریشن شروع کر دیا گیا ہے جسے میڈیا میں کرپشن کے خلاف آپریشن قرار دیا جا رہا ہے۔ اب تک اس آپریشن میں دو اہم شہزادوں سمیت کئی افراد قتل ہو چکے ہیں اور درجنوں شہزادوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ محمد بن سلمان نے معیشت کی جدیدیت کا ایک منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت نئے عالمی معیارات کے ساحل، نئے اور جدید شہر تعمیر کیے جائیں گے۔ عورتوں کو آزادی دی جائے گی۔ پہلے ہی ڈرائیونگ اور سٹیڈیم وغیرہ میں جانے کی آزادی عورتوں کو دی جا چکی ہے۔ گویا معیشت کو سیاحت کی انڈسٹری کے ذریعے اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی طرح اسرائیل سے دوستی کی پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں اور ایران سے جنگ کا طبل بجانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس عمل کا آغاز تو کر دیا گیا ہے لیکن یہ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں اور اس سے ریاست کا وجود ہی خطرے میں پڑ چکا ہے۔ اب ایسی کیفیت میں جب سعودی ریاست کا اپنا وجود خطرے میں ہو، اس کے لیے ان مذہبی جنونیوں اور ان کی پروردہ اس ریاست کو پالتے رہنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ بلکہ آقاؤں کی جانب سے مطالبات کی فہرست طویل ہوتی جائے گی جسے پورا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ شدت پسندی کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کے گہرے اثرات مذہب کے نام پر ہونے والی تمام تر سیاست اور ریاستی دھڑوں پر بھی ہوں گے اور بنیاد پرستی مزید نظریاتی ہیجان کا شکار ہوگی۔

2002ء میں پاکستان میں عام انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کے نام سے ایک مذہبی اتحاد تشکیل دیا گیا تھا جنہوں نے بلوچستان اور سرحد یعنی خیبر پختونخواہ میں حکومتیں بھی بنائی تھیں۔ اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا فضل الرحمان نے اپنی جماعت کی ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جو جماعتِ اسلامی سمیت دیگر تمام فرقوں کی پارٹیوں سے اس قسم کے انتخابی اتحاد میں شامل ہونے کی درخواست کرنے کے فریضے پر معمور تھی۔ اگرچہ وہ بڑی محنت کے بعد کامیاب تو ہو گئے ہیں مگر وہ پہلے سا جوش وخروش دکھائی نہیں دے رہا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذہبی پارٹیاں خود ریاست کے مختلف دھڑوں کی نمائندہ ہیں اور پھر ان کو ایک چھتری کے نیچے جوڑنے والا سعودی عرب بھی کٹھ پتلیوں کی بجائے اصل پہلوان کو اکھاڑے میں اتارنے کا خواہشمند ہے۔ پہلے ہی یمن کے لیے پاکستانی فوج بھجوانے کا مطالبہ کیا جا چکا ہے۔ اس لیے یہ اتحاد بنانے کے لیے سخت محنت کرنی پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین ماہ پہلے بنائی جانے والی یہ کمیٹی ان تھک محنت کے بعد ہی کسی 'مثبت' نتیجے پر پہنچ پائی ہے۔ مختلف ریاستی دھڑوں اور مالیاتی گروہوں کی نمائندگی کرنے کے باوجود مسلسل گرتی ہوئی سماجی حمایت ان کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئی ہے۔ اگرچہ یہ اتحاد بن تو گیا ہے لیکن اس دفعہ خیبر پختونخوا سمیت کسی بھی جگہ حکومت بنانا ناممکن دکھائی دے رہا ہے اور سب سے بڑھ کر ریاست کے شدید بحران کے باعث اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ یہ اتحاد انتخابات تک قائم بھی رہ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ اتحاد کسی وجہ سے ٹوٹ گیا تو ان کو عبرتناک انتخابی شکست کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن ریاست کے پاس ان کو حکومتوں میں شامل کروانے کے دوسرے 'چور راستے' بھی موجود ہیں۔

دوسری جانب ایران بھی اپنی پروردہ مذہبی جماعتوں میں بھرپور سرمایہ کاری کر رہا ہے اور ریاست کی جڑوں میں سرایت کرنے کی بھرپور کاوشیں کی جا رہی ہیں جبکہ مذہبی سیاحت کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ دیا گیا ہے۔ شام اور عراق کی سامراجی لڑائی کے لیے بھی یہاں سے خام مال کی مانگ میں اضافہ ہوا ہے۔ ایران کی یہاں پر اس تمام تر سرمایہ کاری کا حجم اتنا زیادہ ہے کہ خود ان پارٹیوں اور دھڑوں میں مال پر خونریز لڑائیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ لیکن اس سارے عمل میں ان جماعتوں کی بھی، فرقہ وارانہ تعصّبات کو فروغ دینے کے باوجود، سماجی حمایت کم ہوئی ہے اور اسی باعث داخلی کشمکش میں بھی زیادہ شدت آئی ہے۔ آنے والے عرصے میں یہ تمام لڑائیاں ان جماعتوں کے اندر اور باہر جاری رہیں گی اور سعودی ایران تنازعے کے بھڑکنے کی صورت میں زیادہ خونریز شکل اختیار کریں گی۔

تحریک انصاف، 'تبدیلی' کیسی تبدیلی؟

ملاؤں کے ووٹ بینک کو تحریکِ انصاف نے بھی اپنے مخصوص پسماندگی اور جدیدیت کے ملغوبے پر مبنی پروگرام کی وجہ سے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ خاص طور پر جماعتِ اسلامی کے ووٹ بینک کے مراکز یعنی شہری درمیانہ طبقہ تحریکِ انصاف کی طرف تیزی سے راغب ہوا تھا۔ خیبر پختونخوا میں دیہی علاقوں میں جمعیت کے ووٹ بینک کو بھی بہت بڑا دھچکہ لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل الرحمن اسٹیبلشمنٹ سے اکثر ناراض دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اتنے بحران کی کیفیت میں بھی مولانا نے ن لیگ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اصل میں اس کی وجہ ن لیگ کی محبت نہیں تھی بلکہ تحریکِ انصاف کی نفرت تھی۔ کیونکہ مولانا بخوبی جانتے ہیں کہ تحریکِ انصاف ان کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرف کے دور میں پیدا ہونے والی اور اپنے لاابالی پن کے باعث اسی کے خلاف عدلیہ بحالی تحریک میں متحرک ہونے والی نوآموز مڈل کلاس نے بھی کہیں نہ کہیں اپنا سیاسی اظہار کرنا تھا۔ تو یوں قدیم اور جدید مڈل کلاس کے ملغوبے کا اظہار تحریکِ انصاف کے جلسے میں تلاوت اور مجرے کے عملیت پسندانہ امتزاج کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ملغوبہ درمیانے طبقے کے ان نوجوانوں کے لیے جماعتِ اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام کے خشک اور بے جان سیاسی پروگرام کی نسبت زیادہ پرکشش ہے جو ایک طرف تو زندگی کی تمام آسائشوں اور مراعات سے مستفید بھی ہونا چاہتے ہیں مگر 'آخرت' بھی خراب نہیں کرنا چاہتے۔ ایسی سوچ اور طرزِ معاشرت درمیانے طبقے میں آج کل فیشن ہے۔ اس لیے مستقبل میں بھی جہاں ایک طرف تھوڑی سست رفتار ہی سہی مگر اس درمیانے طبقے سے تحریکِ انصاف کو ریکروٹمنٹ ملتی رہے گی اور دوسری طرف پہلے سے مذہبی سیاست سے وابستہ لوگ بھی اپنی پرانی وابستگیوں سے مایوس ہو کر یا اکتا کر تحریک انصاف کو تھوڑا بہت سیاسی آکسیجن مہیا کرتے رہیں گے۔ لیکن ساتھ ہی موقع پرستوں کی ایک پرت زیادہ اچھے مواقع کی تلاش میں یا پھر عہدوں، ٹکٹوں یا ٹھیکوں وغیرہ کی تقسیم پر جھگڑے کی صورت میں حکمران طبقے کی دیگر پارٹیوں کی طرف رخ کرتے رہیں گے۔ غرضیکہ تحریکِ انصاف کے حجم میں بہت بڑا اضافہ نہیں ہوگا لیکن اس میں 'آنا جانا' لگا رہے گا۔

کسی حد تک کچھ سنجیدہ نوجوان بھی تبدیلی کی خواہش میں تحریکِ انصاف میں گئے، ان کی بڑی تعداد تو واپس آکر مایوسی کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے لیکن چند ایک ابھی بھی کسی سیاسی معجزے کے انتظار میں وہاں پر دھکے کھا رہے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ نے بھی کئی بار حکومت کے ساتھ مال کی لوٹ مار

پر ہونے والی لڑائی میں تحریکِ انصاف کی قیادت کی اقتدار کی ہوس کو خوب استعمال کیا ہے۔ عمران خان کئی دفعہ خود ساختہ وزیراعظم بن چکا ہے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ کئی جلسوں میں تو وہ تقریر بھی ایسے ہی وزیراعظم کے طور پر کر رہا ہوتا ہے۔ تحریکِ انصاف نے پاکستانی سیاست میں ایک اور اہم برانڈ متعارف کروایا ہے اور وہ جلسوں کی کمرشلائزیشن کا برانڈ ہے۔ حقیقت میں ریاست کا وہ دھڑا جو حکومت کو گرانے کے لیے بہت متحرک تھا اس نے عمران خان کے جلسوں پر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے خرچ کیے ہیں، دوسری طرف عمران خان کو مستقبل کا وزیراعظم سمجھنے والے درمیانے طبقے کے تاجروں نے بھی تحریکِ انصاف پر بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کی ہے۔

روزنامہ ڈان میں 2 اکتوبر 2017ء کو افشاں صبوحی لکھتی ہیں کہ 'پی ٹی آئی، ن لیگ اور پیپلز پارٹی کے عوامی جلسوں کے انتظامی امور کے منتظمین سیاسی لیڈروں کے خاص کارندوں کے مطابق دن میں کھلے عام ایک 5000 افراد کی اوسط شرکت کے جلسے پر 50 لاکھ روپے تک صرف ہوتے ہیں جس میں ساؤنڈ سسٹم، کرسیاں، ٹرانسپورٹ، سٹیج کی تزئین و آرائش اور سکیورٹی وغیرہ کے اخراجات شامل ہیں۔ اگر اس میں کھانا بھی شامل ہو تو پھر یہ اخراجات دوگنا ہو جاتے ہیں لیکن رات کے جلسے میں یہ مزید بڑھ جاتے ہیں۔ اگر دن کے جلسے کے اخراجات کو تقسیم کر کے دیکھا جائے تو سکیورٹی اور ساؤنڈ سسٹم پر ایک تہائی خرچ ہوتا ہے، اس کے بعد سٹیج، کرسیوں، ٹرانسپورٹ اور جھنڈے بینر وغیرہ پر خرچ ہوتا ہے۔ رات کے جلسوں کے لیے 20 فیصد تو صرف بجلی کے لیے استعمال ہونے والے بیک اپ جنریٹرز اور LCDs وغیرہ پر خرچ ہو جاتا ہے۔ جلسہ بڑا ہونے کی صورت میں فی کس خرچہ کم ہو جاتا ہے۔ دیہی علاقوں میں جلسے زیادہ مہنگے پڑتے ہیں کیونکہ وہاں ٹرانسپورٹ اور کھانے وغیرہ پر زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ جلسے میں کھانے کی توقع رکھ کر آتے ہیں اور منتظمین خاص طور پر مقابلے بازی کی اس فضا میں جلسے کے شرکا کی توقعات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے'۔

اس رپورٹ میں میڈیا ایڈورٹائزمنٹ پر ہونے والے بہت بڑے پیمانے کے اخراجات شامل نہیں ہیں جس کے ذریعے خبروں کے بلیٹن اور ٹاک شوز تک کو بھی خرید لیا جاتا ہے۔ اسلام آباد میں ہونے والے عمران خان کے دھرنوں کے اخراجات کا اگر تخمینہ لگایا جائے تو یہ کروڑوں سے اربوں کی طرف جاتا ہوا نظر آئے گا۔ ایسے ملک میں جس کی نصف آبادی حکومتی اعداد و شمار کے مطابق غربت سے نیچے زندگی گزارتی ہو وہاں کھانے کی دیگ کے اوپر لوگوں کا جمع ہو جانا کوئی

حیران کن بات نہیں۔لیکن اب عمران خان کے بڑے بڑے خیر خواہ بھی یہ بات تسلیم کر رہے ہیں کہ عمران خان کی مقبولیت کا گراف گزشتہ کچھ عرصے میں تیزی سے گرا ہے اور گراوٹ کا یہ سفر ابھی جاری ہے۔اس کے علاوہ اقتدار کے انتظار میں بے چین مڈل کلاسیے آپس میں دست و گریبان بھی ہوتے رہتے ہیں۔گزشتہ دنوں کراچی کی اور اندرون سندھ کی تحریکِ انصاف میں کافی پھوٹ دکھائی دی اور صلح کرانے کے لیے مرکز سے لوگوں کو آنا پڑا۔اس صورتحال میں اگرچہ تحریکِ انصاف کے جلسوں پر ہونے والے اخراجات میں اور جلسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا لیکن عمران خان کی عوامی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ متوقع نہیں۔عین ممکن ہے کہ خیبر پختونخوا میں بھی اس دفعہ حکومت بنانے کے لیے تحریک انصاف کو مزید وسیع اور مختلف النوع اتحاد کی ضرورت پڑے۔اقتدار کے انتظار کی طوالت کی وجہ سے عمران خان کی اپنی ذہنی صحت بھی مسلسل بگڑتی جا رہی ہے۔اس کے کوکین وغیرہ کے استعمال کے چرچے بھی زباں زدِ عام رہتے ہیں۔ابھی حال ہی میں ایک ٹی وی انٹرویو میں موصوف بوکھلاہٹ میں یہ بھی کہہ گئے کہ 'یہ تو اچھا ہوا کہ 2013ء میں ہمیں مرکز میں حکومت نہیں ملی ورنہ یہاں بھی پختونخوا جیسا حال ہی ہوتا'۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دو عشرے ہو چکے مگر آج بھی عمران خان سیاست کا منجھا ہوا کھلاڑی نہیں بن پایا۔عمران خان کی طرح اس کے پرستار بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ کرکٹ اور سیاست کے میدان الگ الگ ہیں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔لیکن پاکستانی ریاست کے بحران کی نوعیت اور شدت کے باعث ریاستی اداروں کو سیاست کے میدان میں زیادہ منجھے ہوئے شاطر مہرے کی ضرورت ہے۔

عمران خان اور تحریک انصاف کا سب سے زیادہ زور اور شور شرابہ تعلیم پر تھا۔لیکن چار سال کے صوبائی اقتدار کے بعد جب ہم صوبے میں تعلیم کے شعبے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں باقی صوبوں سے مختلف صورتحال دکھائی نہیں دیتی۔اب تو تعلیم اور صحت کے شعبے میں بھی بڑے پیمانے کی نجکاری کی جا رہی ہے۔ہزاروں محنت کشوں کو بیروزگار کرنے کی اس پالیسی کے باعث عمران خان کی مقبولیت اور ساکھ مزید متاثر ہو رہی ہے۔

خاص طور پر خیبر پختونخواہ کے اساتذہ کی فقیدالمثال تحریک نے تحریک انصاف کی حکومت کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔گزشتہ پورے سال سے وقتاً فوقتاً اساتذہ نے ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہو کر صوبائی دارالحکومت کے سیاسی ماحول کو کئی بار گرمایا ہے۔لیکن حکومت کی طرف سے ہمیشہ

جھوٹے لارے لگا کر احتجاج ختم کرا دیا جاتا رہا۔ تنگ آ کر اسی مہینے اساتذہ نے بنی گالہ میں عمران خان کے محل کے باہر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر احتجاج کیا۔ عمران خان کو مجبوراً اسی ماہ ان کے تمام مطالبات ماننے کا نوٹیفکیشن جاری کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ لیکن اس پر ابھی تک عملدرآمد نہیں ہوا اور دوبارہ اساتذہ اسلام آباد کا رخ کر رہے ہیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں اساتذہ کی اس مزاحمت پر خال خال ہی کوئی رپورٹ دیکھنے میں ملتی ہے حالانکہ اس کے جلسوں میں دکھائے جانے والے افراد سے زیادہ لوگ اس کے گھر کے باہر اکثر احتجاج کر رہے ہوتے ہیں۔ عمران خان کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ الیکشن کے سال میں اس طرح کے اقدامات جن سے ہزاروں لوگ بیروزگار ہوں، سماجی حمایت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں مگر دوسری طرف اگر وہ ان تحریکوں کے دباؤ میں آ کر حکومتی پالیسی سے دستبردار ہونے کا اعلان کرتا ہے تو سامراجی آقاؤں کے سامنے اس کی سامراجی پالیسیوں پر عملدرآمد کروا سکنے کی نا اہلیت کی وجہ سے آئندہ الیکشن میں ان آقاؤں کی حمایت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس سے قبل ینگ ڈاکٹرز نے بھی صوبے بھر میں اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتال کیے رکھی۔ نجکاری کی پالیسی کا تسلسل مزید بڑی احتجاجی تحریک کا موجب بنے گا اور عمران خان کے لیے مزید مسائل پیدا ہوں گے۔

ن لیگ اور جمہوریت کا سراب

نام نہاد بائیں بازو نے نواز شریف کو قریب قریب ایک بورژوا جمہوری انقلاب کا قائد بنا چھوڑا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس وقت اسٹیبلشمنٹ اور ن لیگ میں یا انفرادی حیثیت میں نواز شریف کے ساتھ کوئی بڑی لڑائی چل رہی ہے۔ اس لیے جمہوریت کے دفاع کے لیے اس جدوجہد میں نواز شریف کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ سب نری بکواس ہے۔ اس ملک میں سب سے بڑی عوام دشمن اور ردِ انقلابی جماعت ن لیگ تھی اور آج بھی ہے۔ خواجہ آصف نے امریکہ یاترا کے دوران فوج کی چند پالیسیوں پر تنقید کی بلکہ یوں کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ امریکہ کی طرف سے پاکستانی ریاست پر ہونے والی تنقید کی کسی حد تک تائید کی۔ خاص طور پر ملاؤں کی پرورش والے معاملے پر ایک طرح کا اعتراف کیا تو ہمارے خوش فہم بائیں بازو کے دل خواجہ صاحب کے قدموں میں نچھاور ہونے کو اچھلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب یہ سب بیانات عوام یا جمہوریت کے عشق میں نہیں دے رہے تھے بلکہ امریکہ بہادر کی

ناراضگی کو کسی حد تک کم کرنے کے لیے رالیں ٹپکاتے ان سامراجی آقاؤں کے ایوانوں کا طواف کر رہے تھے۔ ساتھ ان کو پاک افواج کے 'حقیقت پسند' حصے کی مکمل آشیر باد حاصل تھی۔ دوسری طرف جس طبقے کی یہ پارٹی نمائندگی کرتی ہے یعنی سرمایہ دار اور تاجر برادری ان کے بھی ریاست کے علاقائی طاقتوں کے ساتھ تصادم کی پالیسی پر شدید تحفظات ہیں۔ اصل میں ملکی تجارت بری طرح برباد ہو رہی ہے اور بڑے تاجروں اور برآمد کنندگان کی شدید خواہش ہے کہ انڈیا کے ساتھ اور خطے کے دیگر ممالک کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کیے جائیں خواہ اس کے لیے دو چار حافظ سعید کی طرح کے مہروں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ ن لیگ اور فوج کی آپس میں کوئی لڑائی نہیں بلکہ لڑائی ایک طرف فوج کے اندر ہے جو پھر سیاست، صحافت اور حتیٰ کہ سفارتکاری میں بھی اپنا اظہار کر رہی ہے اور دوسری طرف ن لیگ کے اپنے اندر اور نواز شریف کے اپنے خاندان کے اندر لڑائی موجود ہے۔ اور یہ تمام لڑائیاں پاکستان کی معیشت اور ریاست کے عمومی بحران کا ہی تسلسل ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ نواز شریف کی نااہلی ایسی صورتحال میں بورژوا نکتہ نظر سے ایک درست فیصلہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ پہلے سے چلا آ رہا بحران شدید گہرا ہو گیا ہے بلکہ نئے بحران بھی جنم لے رہے ہیں۔ ریاست کو خود نواز شریف جیسے گھاگ اور تجربہ کار سیاستدان کی ہی ضرورت ہے مگر اب پاناما مقدمے سے شروع ہونیوالا بحران اس نہج پر آ گیا ہے کہ نواز شریف کو اس نظام کی مزید خدمت کے لیے بچانا شاید ممکن نہ ہو سکے۔ لیکن دوسری طرف ن لیگ کی صدارت کے لیے نواز شریف کو پھر منتخب کر لیا گیا ہے جس پر کورٹ کے یہ ریمارکس سامنے آئے ہیں کہ 'یہ لوگوں کا جمہوری حق ہے وہ چاہے کسی نااہل کو ہی اپنی قیادت کے لیے چن لیں'۔ تو پھر ایک منتخب شدہ وزیر اعظم کو نااہل قرار دینے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جسے عوام کی 'بھاری اکثریت' نے منتخب کیا ہو۔ لیکن نواز شریف کے مخالفین پارٹی کے اندر نواز شریف کی قیادت کے خلاف دباؤ بڑھائیں گے۔ دوسری طرف ملکی سطح کی سیاست کے بہت سے مہرے شہباز شریف کی قیادت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ پھر یہ لڑائی دوسری نسل کو منتقل ہو جاتی ہے۔ NA-120 کی کامیابی کے بعد سے مریم بی بی کی قائدانہ صلاحیتوں کے بہت چرچے ہیں۔ اس سے قبل یہی تصور کیا جاتا تھا کہ شہباز شریف کا بیٹا حمزہ شہباز ہی پارٹی کی باگ دوڑ سنبھالے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ انتخابات سے قبل ن لیگ میں یہ دراڑیں کسی سپلٹ کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ن

لیگ آئندہ حکومت کا بھی حصہ ہوگا مگر وہ ایک مختلف ن لیگ ہو۔ محض مائنس ون سے ن لیگ کو اسی شکل میں برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر نواز شریف کو پارٹی قیادت سے فارغ کروایا جاتا ہے تو لازماً پارٹی کے اندر ٹوٹ پھوٹ بھی ہوگی اور پھر اس کا فیصلہ ن لیگ کے باہر طاقت کی عمومی بندر بانٹ پر ہی ہوگا کہ ریاست کا کون سا دھڑا نئی حکومت کی تشکیل میں قائدانہ کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن ن لیگ کی ٹوٹ پھوٹ سے خود اسٹیبلشمنٹ کے لیے مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھیں گے اور آئندہ حکومت کو چلانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے زیادہ تجربہ کار ماہرین نواز شریف کے لیے درمیانہ راستہ نکالنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

کراچی، ایم کیو ایم اور متبادل کی پیاس

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے جو نہ صرف کراچی کے لوگوں کا بلکہ ملک کے طول وعرض سے آنے والے لاکھوں محنت کشوں کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ اس لیے یہ ملک میں بسنے والی تمام قومیتوں کا مجموعہ بھی ہے۔ یہ نہ صرف اردو بولنے والے مہاجروں کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ یہ بلوچوں اور پٹھانوں کا بھی سب سے بڑا شہر ہے۔ 69-68ء کے انقلاب میں تمام قومیتوں کے محنت کشوں نے مل کر اور یکجان ہو کر اس نظام اور ریاست کو چیلنج کیا تھا جس کی ناکامی کے بعد ہونے والی مایوسی کو استعمال کرتے ہوئے ریاست نے محنت کشوں کو زبان اور قوم کی بنیاد پر بآسانی تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے جو سیاسی قوت ابھر کر سامنے آئی تھی وہ مہاجر قومی موومنٹ یعنی MQM ہے۔ یہ جماعت گزشتہ تین دہائیوں سے کسی نہ کسی شکل میں اقتدار میں بھی ہے مگر ساتھ ساتھ اس کے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ تضادات بھی ابھرتے رہے ہیں۔ اصل میں خود ریاست کی کمزوری کے باعث جہاں ریاست کے پالتو ملاؤں نے ریاستی دھڑے بندی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست کے اندر اپنی ریاست بنالی تھی ایسے ہی MQM بھی ریاست کے اندر ریاست کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اسٹیبلشمنٹ نے اس کے خلاف بار بار آپریشن کیے اور اس میں کئی نئے دھڑے بھی بنائے جن میں حقیقی اور اسی طرح کے دوسرے گروپ بن کر سامنے آئے۔ انڈیا سے آئے ہوئے مہاجرین اگرچہ سب اردو بولتے ہیں مگر وہ سب مختلف علاقوں سے آئے ہیں اور ان کے لب و لہجے بھی مختلف ہیں۔ ریاست نے ان فروعی تضادات کو بھی استعمال کر کے بہاری قومی موومنٹ بنانے

کی کوشش بھی کی مگر اس میں بڑی کامیابی نہیں ہوسکی۔ لیکن اسی عرصے میں MQM کی قیادت ملک سے فرار ہوکر برطانیہ میں سیاسی پناہ لے کر وہاں مقیم ہوگئی اور انہی چند سالوں میں پارٹی کے کردار کو نہ صرف سندھ بھر میں بلکہ ملک بھر میں بڑھانے کی غرض سے پارٹی کا نام بدل کر مہاجر قومی موومنٹ سے متحدہ قومی موومنٹ بھی کر دیا گیا۔ پاکستانی ریاست سے ناراض یہ قیادت چونکہ کوئی انقلابی نظریات سے مسلح نہیں تھی بلکہ درمیانے طبقے کے تشخص کے بحران کی پیداوار تھی، اس لیے اس کا بیرونِ ملک قیام کے دوران پاکستانی ریاست کے ساتھ تضادات کی وجہ سے دوسری اہم اور بڑی سامراجی ایجنسیوں پر انحصار بڑھتا چلا گیا جن میں MI-5 یا MI-6 اور امریکی CIA وغیرہ شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بھارتی خفیہ ایجنسی را کے ساتھ بھی اس قیادت کے مراسم بن گئے۔ اس لیے کراچی کو MQM سے واپس لینے کی لڑائی ریاست کے لیے بہت اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ یا پھر MQM کو بیرونِ ملک مقیم قیادت کے اثر و رسوخ سے باہر نکال کر اسے اپنے کنٹرول میں لانا ریاست کے لیے بہت بڑا چیلنج بنتا جا رہا تھا۔ مگر مشرف کے دور میں ریاست کے داخلی تضادات اور گہرے ہوگئے جن میں مہاجر پس منظر کی وجہ سے اور طاقت کا توازن اپنے حق میں رکھنے کی غرض سے مشرف کا MQM پر انحصار بہت بڑھ گیا تھا اور ایسی صورت میں وہ ریاست کے لانگ ٹرم منصوبے پر عمل درآمد کرنے کی بجائے MQM کو مالی طور پر مزید نوازنے پر مجبور ہوگیا۔ مگر اس عرصے میں MQM کی اس متجاوز طاقت کو کنٹرول کرنے کے لیے ریاست نے دیگر قومیتوں میں مسلح گروپ تیار کرنا شروع کر دیئے تھے اور پیپلز امن کمیٹی اور ANP کے ان مسلح گروپوں کے ذریعے بھی کراچی کو مکمل طور پر MQM سے آزاد نہیں کرایا جا سکتا تھا کیونکہ اس طریقے سے ایک خونی خانہ جنگی کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے اور ان مسلح گروپوں کے اپنے اندر ٹوٹ پھوٹ کے عمل کی وجہ سے یہ خود ریاست کے لیے خطرہ بننا شروع ہوگئے جس کے باعث پھر ریاست نے ان کے خلاف بھی بڑے آپریشن کیے۔ اس تجربے کی ناکامی کے بعد ریاست نے یہ سبق سیکھا کہ MQM کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل ہی نکالا جائے۔

تحریک انصاف کو کراچی میں ایک متبادل کے طور پر سامنے لایا گیا جس کو ابتدا میں کافی پذیرائی بھی ملی۔ 2013ء کے انتخابات میں MQM کی طاقت کے مراکز میں تحریک انصاف کو پڑنے والے ہزاروں اور مجموعی طور پر لاکھوں ووٹ MQM کے لیے باعثِ تشویش بنے اور ان کے داخلی تضادات بھی کھل کر سامنے آئے۔ لیکن بغیر پولنگ ایجنٹوں کے اتنے ووٹوں کا مطلب یہ تھا

کہ کراچی کے اردو بولنے والے بھی ایک نئے متبادل کے لیے بلک رہے ہیں۔ وہ لوگ عمران خان کی محبت میں جان خطرے میں ڈال کر پولنگ سٹیشن نہیں گئے تھے بلکہ اپنی عشروں کی مجبوریوں اور محرومیوں کا تدارک کرنے کی لگن انہیں کھینچ کر وہاں لے گئی۔ MQM کے مسلسل قتدار میں رہنے کے باوجود بھی آبادی کی اکثریت کے مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے تھے۔ خاص طور پر مشرف دور میں MQM کی طاقت اور دولت کی ریل پیل نے ایک نئی اردو بولنے والی اشرافیہ کو جنم دیا تھا جو درحقیقت لینڈ مافیا اور سفید پوش جرائم پیشہ افراد پر مشتمل تھی۔ ان کی زندگیوں میں تو بڑی تبدیلی آئی تھی لیکن عام لوگوں کے معیارِ زندگی میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ کچھ سڑکیں اور پل وغیرہ بنا کر تمام اردو بولنے والوں کو رام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس پر تعیش دورِ اقتدار میں جو تھوڑا بہت سیاسی عنصر MQM میں بچا تھا وہ بھی جاتا رہا یا نہ ہونے کے برابر ہی رہ گیا اور پارٹی کے تنظیمی ڈھانچوں پر سارے مفاد پرست اور 'کاروباری' خواتین و حضرات کی جکڑ مضبوط ہو گئی۔ یوں حقیقی تبدیلی پسند عناصر کی شمولیت کے لیے ایک متبادل کا خلا اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ لیکن عمران خان اور اس کی ٹیم میں اتنی اہلیت ہی نہیں تھی کہ وہ متبادل کے خلا کو پر کر سکتے۔

عمران خان پنجاب میں بیٹھ کر تو متحدہ کی قیادت کے خلاف سخت زبان استعمال کرتا تھا مگر کراچی آ کر 'آدھا مہاجر' بن جاتا تھا اور MQM کی قیادت کی طرف مفاہمت پر مبنی رویہ اپنا لیتا تھا۔ یہ دوغلا پن کراچی کے عوام کی امنگوں کی ترجمانی کرنے سے قاصر تھا، جس کے باعث لوگ ووٹ کاسٹ کر کے اپنی خواہشات کا اظہار کرنے کے بعد مستقل طور پر تحریک انصاف میں نہیں گئے لیکن ساتھ ہی MQM کے جلسوں میں بھی عوامی شرکت کم ہوتی گئی۔ MQM کے آج تک قائم رہنے کی سب سے بڑی وجہ مہاجروں میں موجود عدم تحفظ کی نفسیات ہے جس کو کم کرنے کی بجائے پشتونوں اور بلوچوں کے مسلح گینگ بنا کر اسٹیبلشمنٹ نے اور بھی بڑھا دیا ہے۔ لیکن MQM کے قائد الطاف حسین کی اپنی ذہنی کیفیت بھی اسی عرصے میں کافی مشکوک ہوتی گئی، خاص طور پر منی لانڈرنگ اور عمران فاروق قتل جیسے مقدمات نے الطاف حسین کی ذہنی صحت کو بری طرح متاثر کیا اور آئے روز کسی نہ کسی عوامی ٹیلیفونک خطاب کے دوران کوئی ایسی عجیب اور مضحکہ خیز بات سامنے آ جاتی تھی جس کے باعث مقامی قیادت کو شرمندگی کے تاثرات کے ساتھ اس کا دفاع کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اسی ذہنی کیفیت کے بگڑنے کے باعث گزشتہ برس اگست میں الطاف حسین نے خود اسٹیبلشمنٹ کو وہ موقع فراہم کیا جس کا انہیں برسوں سے انتظار تھا۔ 'پاکستان مردہ باد' کے نعرے کے

بعد فوج کو کھل کر کراچی میں MQM کے خلاف بڑے آپریشن کا موقع مل گیا۔ قومی اور مختلف صوبائی اسمبلیوں سے قراردادیں پاس کروا کر انہوں نے الطاف حسین کو غدار قرار دے کر اس کے ٹیلیفونک خطاب وغیرہ پر پابندی عائد کر دی اور بالآخر MQM کی مقامی قیادت نے صورتحال کو قابو سے باہر ہوتا ہوا دیکھ کر MQM پاکستان بنانے کا اعلان کر دیا جس نے بظاہر الطاف حسین کے پاکستان دشمن جذبات کی شدید مذمت کی اور یوں کسی نہ کسی طریقے سے MQM کی قانونی حیثیت کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب MQM لندن جس کی قیادت الطاف حسین کر رہا ہے اس پر قانونی پابندی ہے اور MQM پاکستان جس کا قائد فاروق ستار کو سمجھا جاتا ہے، حقیقت میں سب جانتے ہیں کہ الطاف حسین ہی MQM کا قائد ہے، اب سیاسی پروگرام وغیرہ کرنے کی قانونی طور پر مجاز ہے مگر پھر بھی MQM کے بہت سے دفاتر بند کر دیئے گئے ہیں اور بہت سے کارکنوں کو MQM لندن سے تعلق کے شبے میں گرفتار بھی کیا گیا ہے۔

لیکن ان تمام ٹوٹکوں کے باوجود ریاستی ادارے بخوبی جانتے ہیں کہ الطاف حسین کا اثر رو رسوخ کراچی اور حیدرآباد سمیت اردو بولنے والی آبادی میں آج بھی موجود ہے جسے یہ ریاستی ادارے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ PSP کا تجربہ بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگرچہ چند ایک اسمبلی ممبران کو مقدمات کے خوف سے PSP شامل کروا لیا گیا ہے مگر تمام تر ریاستی آشیرباد کے باوجود مصطفیٰ کمال ابھی تک طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ آئندہ انتخابات کے حوالے سے شدید پریشانی سے دوچار ہے۔ ریاستی ادارے کسی بھی قیمت پر MQM کو کراچی میں اکثریت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ اس کے لیے ایک نیا منصوبہ بنایا گیا کہ پہلے تو کراچی کے ڈپٹی میئر کو منی لانڈرنگ کے مقدمات سے خوفزدہ کر کے PSP میں شامل کرایا گیا اور اس کے بعد فیصلہ کن وار کے لیے براہِ راست فاروق ستار کو حدف بنایا گیا۔ منصوبہ درحقیقت کچھ یوں تھا کہ پہلے مرحلے میں PSP اور MQM پاکستان کا ایک اتحاد بنایا جائے گا، جو ایک مشترکہ انتخابی نشان کے ساتھ انتخابی مہم چلائے گی اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے ایک نئی پارٹی بنانے کی ضرورت پڑتی اور یوں MQM سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جاتی۔ یہ ایک انتہائی احمقانہ منصوبہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے ریاستی ادارے مسلح جتھوں اور انڈر ورلڈ کی پرورش کر کر کے بہت فلمی یا ڈرامائی ذہنیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ میکانکی سوچ کی معراج ہے کہ ایک سیاسی پارٹی کی قیادت کو اوپر سے عسکری پنجے میں پھنسا کر کہیں بھی بٹھا

دیا جائے گا تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے نصف شب مصطفیٰ کمال اور فاروق ستار سے مشترکہ پریس کانفرنس میں یہ منصوبہ ایک فلم کے ٹریلر کی طرح ریلیز کیا گیا۔ لیکن اسی پریس کانفرنس میں مصطفیٰ کمال مستقبل میں متوقع طاقت کے نشے اور گھمنڈ میں MQM کے بارے میں کچھ زیادہ ہی بول گئے۔ جس کا ردِعمل اگلے دن رابطہ کمیٹی کی پریس کانفرنس کی شکل میں سامنے آیا جس میں PSP کے ساتھ پارٹی کو ضم کرنے کے منصوبے کو ماننے سے انکار کر دیا گیا لیکن اتحاد کی آپشن کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ جواباً فاروق ستار نے پارٹی قیادت سے مستعفی ہونے کا ناٹک کیا اور پھر نئی پریس کانفرنس میں مصطفیٰ کمال پر تنقید کی بارش کر دی۔ مختصر یہ کہ اسٹیبلشمنٹ کا یہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا اور فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی فلاپ ہو گئی۔ حقیقت میں بچہ بچہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ وردی والوں کا کھلواڑ ہے۔ اردو بولنے والے MQM سے بہت خوش نہ بھی ہوں لیکن وہ وردی والوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حال ہی میں PSP کے خلاف نکالی گئی MQM کی ریلیوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ جس بھی قیادت، فرد یا پارٹی کے سر پر وردی والوں کا ہاتھ ہو گا وہ کبھی بھی کراچی میں MQM کے متبادل کے طور پر سامنے نہیں آسکتی۔ عمران خان اور مصطفیٰ کمال دونوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی ہے۔ ان حربوں اور مکارانہ حیلوں سے الطاف حسین کو نقصان ہونے کی بجائے فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اگر اس کی مقبولیت بڑھ نہیں رہی تو ان حربوں سے کم بھی نہیں ہو رہی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی MQM کا حقیقی لیڈر الطاف حسین ہی ہے۔ لیکن اس کا قطعاً مطلب یہ نہیں کہ اردو بولنے والوں کی اکثریت کی MQM کی شکل میں سیاسی نمائندگی ہو رہی ہے۔ بلکہ اس کے الٹ صرف عدم تحفظ کی نفسیات کے تحت لوگ کسی دوسرے متبادل کی عدم موجودگی کے باعث MQM پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔ قیادت اور متبادل کا جتنا بڑا خلا آج کراچی میں اور بالخصوص اردو بولنے والی آبادی میں موجود ہے ماضی میں کبھی بھی نہیں تھا اور ایک حقیقی معنوں میں وردی کی طاقت کے بغیر عوامی نعروں اور پروگرام پر مبنی پارٹی کے لیے کراچی کے حالات پک کر تیار ہو رہے ہیں۔

پیپلز پارٹی، روایت کا ملبہ

آصف علی زرداری نے اس بحران کو بھانپ کر اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے MQM کی پارلیمانی پارٹی کے لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ کراچی میں پارٹی پوزیشن کو کچھ

بہتر کیا جا سکے۔ مستقبل میں بھی یہ کوشش کی جاتی رہے گی اور شاید ایک آدھ لوگ اس ٹوٹ پھوٹ میں ٹوٹ کر پیپلز پارٹی کی جھولی میں بھی آ گریں۔ لیکن پیپلز پارٹی عمومی طور پر کراچی سمیت سندھ کے اردو بولنے والوں کے لیے کبھی بھی MQM کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عدم تحفظ کی نفسیات کا شکار مہاجر آبادی اس وقت پیپلز پارٹی کو سندھی حکمران طبقے کی نمائندہ پارٹی سمجھتے ہیں اور 'مرسوں، مرسوں، سندھ نہ ڈیسوں' کے نعرے مارنے والی اس قیادت کو وہ اپنے لیے خطرہ ہی سمجھتے ہیں اور دیکھا جائے تو یہ بات ایک حوالے سے درست بھی ہے کہ اس وقت پیپلز پارٹی ایک وفاق کی پارٹی نہیں رہی ہے بلکہ محض سندھ کی پارٹی بن کر رہ گئی ہے اور سندھ کے وڈیروں کا لگ بھگ 95 فیصد اس وقت پیپلز پارٹی میں آ چکا ہے۔ اور وہ وڈیرہ ذہنیت اردو بولنے والی شہری آبادی کے لیے کسی صورت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر محنت کش ان وڈیروں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سندھ کے ہاری، دیہی پرولتاریہ اور چھوٹے کسان بھی ان وڈیروں اور جاگیرداروں سے نفرت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گزشتہ دس بارہ نسلوں سے مسلسل یہی وڈیرے ان کے آباؤ اجداد پر حکمرانی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کا ان محکوم انسانوں سے رویہ اپنے کتوں کے ساتھ رویے کی نسبت بھی کئی درجے حقارت انگیز ہے۔ کتوں کو تو پھر بھی پیٹ بھر کر کھلایا جاتا ہے، نہلایا اور دھلایا جاتا ہے مگر سندھ کے ہاریوں کو ذرا سی بھی نافرمانی پر انہی کتوں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے۔ ان کی بچیوں کی عزتیں ان کے حاکموں کی ہی ملکیت ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک بچی کو سیہون میں اس کے گھر میں گھس کر صرف اس لیے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے جسمانی اور جنسی غلامی سے انکار کرنے کی ہمت کی تھی۔ اس پر این جی اوز نے بہت شور شرابہ کیا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ حالانکہ یہ سندھ کے وڈیروں کا معمول ہے، خبر صرف اس وقت بنتی ہے جب کسی کی جان چلی جائے ورنہ عزت کے ساتھ کھلواڑ تو معمول کی بات ہے۔ ان وڈیروں میں سے بہت سوں کی نجی جیلیں ہیں جہاں سفاکیت اور جبر کے پہاڑ ان محنت کشوں پر توڑے جاتے ہیں۔ کراچی میں عرفان اللہ مروت کے پارٹی میں آنے پر تو آصفہ اور بختاور نے ٹویٹ کر کے اس کا نوٹس لیا تھا مگر یہ سارے درندے جو گزشتہ عشرے میں پارٹی میں آ چکے ہیں اور اب پارٹی کے سیاہ اور سفید کے مالک بھی بن گئے ہیں، ان سے پارٹی کو چھٹکارا دلانے کا کسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ الٹا باقی ماندہ وڈیروں سے بھی پارٹی میں شمولیت کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔ ایسے میں کراچی اور حیدر آباد کے پڑھے لکھے درمیانے طبقے اور محنت کش طبقے کے لیے پیپلز پارٹی کی آپشن

نا قابلِ قبول ہے۔

اصل میں اس وقت پاکستانی ریاست کی سب سے زیادہ منظورِ نظر اور وفادار سیاسی قیادت پیپلز پارٹی کی قیادت ہے۔ آصف علی زرداری کو کرپشن کے مقدمات سے بری کیا جا رہا ہے اور ملک بھر میں جلسے کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ دوسری طرف پارٹی میں نام نہاد بائیں بازو کی خدمات بھی بڑے پیمانے پر دستیاب ہیں۔ ایک ضمیر فروش سابقہ مارکسی سیاستدان کو پارٹی کے ترجمان کی ذمہ داری دے دی گئی ہے تاکہ وہ بار بار پریس کے سامنے مزدور اور کسان وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کر کے پارٹی کے عوامی ہونے کے تاثر کو برقرار رکھے اور کھل کر زرداری اور اس کی بدعنوانی کا بائیں بازو کی ملمع کاری اور ڈھال کے ساتھ دفاع کر سکے۔ ساتھ ہی وہ زرداری کے بیٹے بلاول کو بھی دو چار لفظ عوامی سیاست یا ترقی پسندی کے سکھا کر اسے پنجاب میں گرتی ہوئی بلکہ منہدم ہوتی ہوئی عوامی حمایت کو بچانے کے لیے بھی استعمال کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ اگر یہ بائیں بازو کے مشیر اپنے اس ٹاسک میں کامیاب نہ ہو پائیں تو پیچھے دوسرے بائیں بازو کے غدار نظریہ دان اور سیاستدان بھی لمبی لمبی زبانیں لٹکائے ویٹنگ لسٹ میں اپنا نام لکھوائے بیٹھے ہیں اور بار بار اخباری کالموں کے ذریعے یا اپنی تقریبات میں پارٹی قائدین کو بلا کر اپنی تقریروں کے ذریعے پارٹی کی مرکزی قیادت تک کسی بھی طرح یہ پیغام پہنچانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ 'سرکار ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'، ہم پر بھی کوئی نظرِ عنایت ہو جائے۔ یہ نام نہاد سوشلسٹ آپ کی صحیح خدمت نہیں کر پا رہے ہم اصلی سوشلسٹ زیادہ اچھی خدمت کر سکتے ہیں، ہمیں بھی ایک دفعہ آزما لیجئے۔ آئندہ انتخابات میں پارٹی ٹکٹوں کے حصول کے لیے اپنا ضمیر، روح اور احساس سب کچھ نیلام کر دینے کو تیار یہ نام نہاد بائیں بازو کے لوگ آج بھی یہ دلیل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ پاکستان میں ابھرنے والی محنت کشوں کی ہر تحریک ہر صورت میں پیپلز پارٹی سے ہو کر ہی گزرے گی۔ یعنی پیپلز پارٹی محنت کشوں کی روایت ہے، حقیقت میں اب پیپلز پارٹی محنت کشوں کی روایت تو نہیں رہی ہاں البتہ بائیں بازو کے غداروں اور محنت کشوں کے سوداگروں کی روایت ضرور بن چکی ہے۔ ان نام نہاد مارکسیوں کے علاوہ بھی پیپلز پارٹی کا ایک روایتی بایاں بازو ہے جسے ٹریڈ یونین اشرافیہ اپنا قبلہ اور کعبہ مانتی ہے۔ انہوں نے بھی گزشتہ عرصے سے اقتدار کے طویل دورانیے میں خوب مال بٹورا ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اپنی تقریر میں ہی اپنے باپ کی برسی کے موقع پر یہ کہہ دیا تھا کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ میں مال کمانے میں لگا ہوا ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ پیسے

کس کو اچھے نہیں لگتے''۔ یہ بایاں باز و بھی بری طرح ایکسپوز ہوا ہے اور محنت کش جب بھی کسی تحریک میں ابھریں گے وڈیروں اور جاگیرداروں کے پالتو ان انقلابی لبادے میں چھپے بھیڑیوں سے اپنے ساتھ ہونے والی ہر غداری کا انتقام لیں گے۔

بلاول بھٹو کی شخصیت کے حوالے سے یہ نام نہاد انقلابی بہت سی قیاس آرائیاں اور افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں جیسے آج بلاول بھٹو نے مزدوروں اور کسانوں کے حوالے سے کوئی ریڈیکل بیان دے دیا ہے، فلاں جلسے میں بلاول نے سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف بات کر دی ہے لہٰذا بس اب پیپلز پارٹی کی مردہ روایت زندہ ہونے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بیانات اور تقریروں سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اب بلاول 20 فیصد انقلابی ہو گیا ہے اور اب 40 فیصد۔ گویا بہت جلد وہ 100 فیصد انقلابی ہو جائے گا اور ساری صورتحال تبدیل ہو جائے گی۔ یہ سب احمقانہ باتیں ہیں اور ان کا انقلابی طرزِ فکر سے کوئی لینا دینا نہیں ہے بلکہ یہ لوگ دوبارہ عوام کی امیدیں بلاول سے وابستہ کروانے کی کوشش کرتے ہوئے ریاستی اداروں کا فریضہ ہی سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ درحقیقت اس وقت اگر کسی کو بلاول کے اس 20 یا 40 فیصد انقلابی یا نیم انقلابی کردار کی ضرورت ہے تو وہ خود اسٹیبلشمنٹ کو ہے کیونکہ وہ کسی برائے نام ہی سنجیدہ سیاسی عمل کی عدم موجودگی یا اپوزیشن کے روایتی کردار کے فقدان کی وجہ سے شدید پریشان ہیں۔ ماضی میں یہ کام پیپلز پارٹی سے لیا جاتا رہا ہے۔ بلاول بھٹو کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو بائیں بازو تو دور کی بات ہے وہ دائیں بازو کی قیادت کے طور پر بھی خدمات سر انجام دینے سے قاصر معلوم ہوتا ہے۔ بینظیر بھٹو یا ذوالفقار علی بھٹو سے بلاول کا موازنہ کرنا ہی بہت بڑی حماقت ہو گا کیونکہ وہ بالکل مختلف عہد کی پیداوار تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں سوویت یونین اور کمیونسٹ چین عالمی سیاسی افق پر موجود تھے جس کی وجہ سے وہ مختلف انقلابی اصطلاحات اور نعرے بازی وغیرہ سے متعارف تھا اور بعد ازاں اس نے فرانس اور یورپ کے واقعات کا قریب سے مشاہدہ بھی کیا اور ان تمام تجربات سے اس نے اہم سیاسی اسباق سیکھے جن کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے پاکستان میں محنت کش طبقے کی تحریکوں کو منزل پر لیجانے کی بجائے گمراہ کر دیا اور اس تمام عمل کو اپنی شخصی قیادت کی تعمیر کے لیے بہت خوبصورتی سے استعمال کیا۔ ایسے ہی اس نے اپنے بچوں اور بالخصوص بینظیر بھٹو کی سیاسی تربیت کی تھی اور پھر بے نظیر کو ضیاء الحق کی آمریت نے بھی کافی کچھ سکھا دیا تھا۔ اس کے برعکس بلاول بھٹو کی تربیت بالکل مختلف

ماحول میں ہوئی ہے۔ اسے سوویت یونین جیسی کسی دیوہیکل مزدور ریاست کے وجود کا کوئی تجربہ نہیں اور اس نے اس دور میں شعور کی آنکھیں کھولی ہیں جس میں سرمایہ داری کو انسانیت کا مقدر اور نیولبرل اکانومی کو ہی بہترین اور واحد نظام سمجھا جاتا ہے اور بے نظیر بھٹو کی طرح اس کے والدین نے اس کو کسی قسم کا لٹریچر وغیرہ بھی نہیں پڑھایا ہے۔ بے نظیر تو اپنے بچوں کے سیاست میں آنے کے حق میں ہی نہیں تھی اور زرداری نے جو تربیت اپنے بچوں کو دی ہوگی اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ اب یہ بائیں بازو کے غلیظ اصلاح پسند اس کے منہ میں دو چار جملے محنت کشوں کے حق میں ڈال کر اسے بھٹو بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں تاکہ خود بھی طویل اقتدار کے مزے لوٹ سکیں۔ یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ بلاول اور آصف علی زرداری کے بیچ شدید اختلاف ہے اور بہت جلد بلاول زرداری کو سیاست سے بے دخل کر دے گا۔ یہ سب باتیں وقت نے خود غلط ثابت کر دی ہیں اور اب بلاول کھل کر زرداری کا سیاسی جانشین بن کر سامنے آیا ہے جس کا پیپلز پارٹی کے تابناک ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

انتخابات، ٹیکنو کریسی اور بند گلی

پاناما کے مقدمے میں نا اہلی کے فیصلے کے خلاف نواز شریف کی اپیل مسترد ہونے کے بعد پاکستان کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے بہت سی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ خاص طور پر آئندہ چند ماہ میں سیاسی بساط پھر بچھنے والی ہے اور ماضی کی طرح ریاستی اداروں کے لیے من مرضی کی حکومت بنانا بہت آسان دکھائی نہیں دے رہا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں اپنی عوامی حمایت مکمل طور پر کھو چکی ہیں۔ کوئی بھی پارٹی اکیلی حکومت بنانے کا خواب دیکھنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔ بظاہر ریاستی اداروں اور ریاست کے مختلف دھڑوں کے پاس دو ہی آپشن نظر آ رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ تحریک انصاف کو مرکز میں کسی بہت غیر معمولی سیاسی اتحاد کی بنیاد پر حکومت میں لے آئیں۔ لیکن اس کے لیے بہت بڑے پیمانے کی انتخابی دھاندلی کی ضرورت پڑے گی کیونکہ ن لیگ کرپشن اور پاناما وغیرہ میں شدید بحران سے دوچار ہونے کے باوجود انتخابی سیاست کے حوالے سے ابھی تک سب سے بڑی پارٹی ہے۔ خاص طور پر پنجاب میں تحریک انصاف نے ن لیگ کی نسبت پیپلز پارٹی کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ن لیگ کو اقتدار سے باہر رکھنے کے خواہشمند ریاستی دھڑے نے گزشتہ عرصے میں بالائی اور اندرون پنجاب میں پیپلز

پارٹی کے بہت سے لوگوں کو تحریکِ انصاف میں جبکہ جنوبی پنجاب کے بہت سے وڈیروں اور electables کو پیپلز پارٹی میں شامل کروایا ہے تاکہ ن لیگ کے مخالف ووٹ تقسیم نہ ہوں اور زیادہ سے زیادہ انتخابی نشستیں ن لیگ سے واپس لی جاسکیں۔اس حوالے سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ پیپلز پارٹی اور تحریکِ انصاف کے ساتھ باقی چھوٹی موٹی پارٹیوں کو ملا کر کوئی حکومت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ریاستی اداروں کا ایک دھڑا تحریکِ انصاف پر اس بحران کے دور میں اکتفا کرنے پر تیار نہیں اور وہ ن لیگ اور پیپلز پارٹی کے اتحاد کے ذریعے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے زیادہ پرامید دکھائی دیتے ہیں۔لیکن یہ دونوں آپشنز بھی بہت محفوظ اور مستحکم دکھائی نہیں دے رہیں۔ جہاں ایک طرف پیپلز پارٹی کو دوبارہ پنجاب اور پختونخوا میں سیاست کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی ہے اور یہ امکان بھی ہے کہ شاید پختونخوا میں آئندہ بننے والی حکومت میں بھی پیپلز پارٹی کو کوئی ادنیٰ سا ہی سہی مگر حصہ دیا جاسکتا ہے وہیں ریاست کے دوسرے دھڑے نے سندھ کے اندر پیپلز پارٹی کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے روایتی اتحاد بنالیا ہے مگر اس کی کامیابی کے امکانات محدود دکھائی دے رہے ہیں۔عملاً اس وقت پیپلز پارٹی ہر سیاسی اتحاد کی ناگزیر ضرورت دکھائی دے رہی ہے کیونکہ خود پیپلز پارٹی نے بھی اب ہمیشہ کے لیے ریاست کی بی ٹیم کا کردار اپنے لیے مختص کرلیا ہے۔ ماضی میں جو کردار MQM مرکز اور صوبے میں ادا کیا کرتا تھی پیپلز پارٹی کا سیاسی مستقبل اس سے کوئی زیادہ مختلف دکھائی نہیں دے رہا۔

دوسری طرف سابقہ صدر پرویز مشرف نے 23 سیاسی پارٹیوں پر مشتمل ایک ''عظیم'' اتحاد کا اعلان کر دیا ہے جس کا نام پاکستان عوامی اتحاد (PAI) رکھا گیا ہے۔ اتحاد کی سرپرستی پرویز مشرف خود کرے گا جبکہ اقبال ڈار جنرل سیکرٹری ہوگا۔اتحاد میں آل پاکستان مسلم لیگ کے علاوہ پاکستان عوامی تحریک، سنی اتحاد کونسل، مجلس وحدت المسلمین، پاکستان سنی تحریک، مسلم کانفرنس (کشمیر)، پاکستان مسلم لیگ جونیجو گروپ، پاکستان مسلم لیگ کونسل، پاکستان مسلم لیگ نیشنل، عوامی لیگ، پاک مسلم الائنس، پاکستان مزدور اتحاد، پاکستان انسانی حقوق پارٹی، ملت پارٹی، جمعیت علمائے پاکستان (نیازی گروپ)، عام لوگ پارٹی، عام آدمی پارٹی، پاکستان مساوات پارٹی، پاکستان منارٹی پارٹی، جمعیت مشائخ پاکستان اور سوشل جسٹس ڈیموکریٹک پارٹی شامل ہیں۔اگرچہ اس اتحاد میں شامل زیادہ تر پارٹیاں برائے نام ہی ہیں اور ان کا ملکی سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔لیکن اس سیاسی اتحاد کے ذریعے مشرف اس پوزیشن میں آنا چاہتا ہے کہ وہ

آئندہ کسی بھی حکومتی اتحاد میں کوئی حصہ حاصل کر سکے۔ وہ خود بھی جانتا ہے کہ جب تک سیاسی شطرنج کے اہم مہروں میں سے کوئی اس کے ہاتھ نہیں لگتا اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ مسلسل تحریک انصاف کی قیادت کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ ان ریاستی اداروں کو تمہیں اقتدار میں لانے کے لیے بہت بڑی سیاسی ضمانت کی ضرورت ہے اور اگر تم میرا ساتھ دو تو تمہاری اقتدار کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ ن لیگ اور پیپلز پارٹی کے ساتھ اس کے اتحاد کے امکانات بہت کم ہیں۔ لیکن مشرف کا زیادہ تر انحصار کراچی کی مہاجر آبادی پر ہوگا۔ وہ جتنا بھی انکار کر لے لیکن حقیقت میں الطاف حسین کے بعد خالی ہونے والی جگہ کو پر کرنے کی اس کی شدید خواہش تھی جواب بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔

PSP اور MQM پاکستان کے اتحاد کے بعد مشرف بہت پر جوش دکھائی دے رہا تھا لیکن اگلے ہی روز یہ ناپائیدار اتحاد بننے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تو مشرف کو شدید دھچکہ لگا اور اس نے مذکورہ بالا اتحاد کا اعلان کر دیا۔ دسمبر میں وہ کراچی میں جلسہ کرنے کا اعلان بھی کر چکا ہے۔ MQM کی اس حالیہ ٹوٹ پھوٹ میں اگر کوئی دھڑا مشرف کے اس اتحاد میں شامل ہوتا ہے تو یہ اتحاد کسی حد تک visible ہو جائے گا بصورتِ دیگر اس کی کوئی سیاسی وقعت دکھائی نہیں دے رہی۔ اسی طرح عدلیہ تحریک کے ہیرو افتخار حسین چوہدری کی سیاسی رونمائی بھی بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ مستقبل میں ریاست اس طرح کے کئی ناکام تجربے کرنے کی طرف جا سکتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ریاستی بحران اتنا شدید ہو جائے کہ کسی بھی قسم کا سیاسی اتحاد بنانا اور اس کو مستحکم کرنا ممکن نہ رہے۔ اس لیے بہت سے پالیسی ساز ابھی سے ٹیکنو کریسی کا شور مچانا شروع ہو گئے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ تحریکِ انصاف پر ہونے والی بہت بڑی سرمایہ کاری کے نتائج سے بری طرح مایوس ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کے خیال میں یہ سارے کا سارا سیاسی عمل وقت، توانائی اور سرمائے کے ضیاع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ کسی کی بھی حکومت بن جائے عوام کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے اور عوام کو بھی اس ریاستی دھڑے کی طرح سارے سیاسی دھارے سے کوئی توقع باقی نہیں بچی۔ اس لیے اس سیاسی بیگانگی کے ماحول میں ٹیکنو کریسی ایک بالکل غیر متعلقہ سیاسی آپشن نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی نئی چیز ہے بلکہ ماضی قریب میں ہی پاکستان میں اس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے۔ پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں شوکت عزیز کو بغیر انتخابات کے وزیرِ اعظم بنا کر بعد میں یہ سیاسی تکلفات بروئے کار لائے گئے۔

شوکت عزیز کا دور عالمی حالات اور معاشی عروج کے باعث ملکی معیشت کے لیے وقتی طور پر دوسروں سے بہتر ثابت ہوا۔ لیکن اس وقت عالمی معیشت کے عروج اور امریکی سامراج کی سیاسی آشیر باد اور مالی معاونت نے اس معاشی استحکام میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اب ان دونوں عناصر کی عدم موجودگی میں کسی بھی پیشہ ور ماہرِ معیشت کے لیے بھی معیشت کو ممکنہ بحران سے بچانا ممکن نہیں۔ اس لیے یہ ایک شارٹ ٹرم آپشن تو ہو سکتی ہے لیکن طویل عرصے تک اس پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال جلد یا بدیر پھر انتخابی عمل کی طرف ہی جانا پڑے گا۔ کچھ لوگ مارشل لا کے امکانات کو بھی زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ انتہائی شدید بحران کی صورت میں ریاست اس قسم کی مہم جوئی کرنے کی طرف جا سکتی ہے مگر اس سے بحران کو ایک معیاری جست لگ سکتی ہے۔ اب کی بار ماضی کی طرح شاید مارشل لا کا بڑے پیمانے پر سیاسی خیر مقدم نہیں کیا جائے گا بلکہ فوری طور پر اس کے خلاف مزاحمت دیکھنے میں آ سکتی ہے۔ اس لیے مارشل لا کوئی بہتر آپشن نہیں ہے اور فوج کے اندر بھی اس آپشن پر اتفاقِ رائے پیدا ہونا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اسی لیے ریاست مختلف قسم کے سیاسی اتحادوں پر ہی اکتفا کرے گی۔ MMA کی طرز پر ملاؤں کا نیا اتحاد، مذکورہ بالا PAI، سندھ میں پیپلز پارٹی کے خلاف بننے والا سیاسی اتحاد، مستقبل میں کراچی میں کوئی نیا سیاسی اتحاد اس طرح کے تجربوں کے ذریعے ہی وفاق اور صوبے میں حکومتیں بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ اب یہ ریاست کچھ بھی کر لے اس ملک میں اب کسی بھی قسم کا سیاسی استحکام آنے والا نہیں۔ انتہائی نحیف اور کمزور ہنگ پارلیمنٹ اب اٹل سیاسی مقدر بن چکی ہے۔

طلبہ سیاست کا نیا جنم

2017ء میں ہمیں ملک میں طلبہ تحریک کا ایک نیا سیاسی جنم نظر آیا ہے۔ طلبہ سیاست پر پابندی عائد ہوئے تین دہائیاں گزر چکی ہیں۔ یہ عرصہ سیاست کے عمومی کردار کو تبدیل کر دینے والا عرصہ تھا۔ حقیقی اور انقلابی سیاست اور نظریات کو پسِ پشت ڈال کر ہر طرف مفاد پرست عناصر غالب آ گئے تھے۔ ایسے ماحول میں طلبہ سیاست کا زوال بھی ناگزیر تھا۔ طلبہ سیاست پر پابندی اصل میں صرف انقلابی یا نظریاتی عناصر کے لیے تھی اور زیادہ تر تعلیمی اداروں میں ریاست کی پروردہ مذہبی، لسانی یا قوم پرست تنظیمیں حاوی رہیں۔ کشمیر اور بلوچستان میں کسی حد تک مخصوص معروضی وجوہات کی بنا پر تھوڑی بہت طلبہ سیاست ہوتی رہی لیکن باقی صوبوں میں فیسوں، ہاسٹلز اور ٹرانسپورٹ

وغیرہ کے مسائل کے حل کے لیے طلبہ اگر کبھی متحرک بھی ہوتے تھے تو یہی رجعتی تنظیمیں زبردستی ان کی نمائندہ بن کر سامنے آ جاتی تھیں۔ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں سیاست کا معیار اس حد تک پست ہو چکا تھا کہ زیادہ تر تعلیمی اداروں میں طلبہ کی کوئی مستقل تنظیم نہیں تھی بلکہ پیپلز پارٹی کے دور میں جہاں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن قابض ہوتی تھی، حکومت بدلتے ہی اور ن لیگ کے اقتدار میں آتے ہی وہاں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن غالب آ جاتی تھی۔ یہ کوئی نئے طلبہ نہیں ہوتے تھے بلکہ زیادہ تر وہی طلبہ جو پہلے ایک پارٹی کے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ایک سیاسی پارٹی کے کسی مقامی فرد یا دھڑے کے گماشتے ہوتے تھے، انہی کی خدمات کو نئی بننے والی حکومتی پارٹی کے مقامی فرد یا کوئی گروہ مستعار لے لیتے تھے۔ سب سے آئیڈیل صورتحال اسے سمجھا جاتا تھا کہ جب جس مقامی سیاسی شخصیت کی یہ تنظیمیں دلالی کرتی تھیں، وہ شخصیت خود ہی حکومتی پارٹی میں شامل ہو جاتی تھی۔ ایسے میں دیواروں پر لکھے گئے نام بھی تبدیل نہیں کرنے پڑتے تھے، محض M (مسلم) کی جگہ P (پیپلز) لگا دیا جاتا تھا، یا پھر حسبِ ضرورت اس کے الٹ کر لیا جاتا تھا۔ طلبہ کی ایک معمولی سی پرت ہی اس سارے کھلواڑ میں ملوث ہوتی تھی۔ زیادہ تر طالبِ علم یا تو مسابقت پر مبنی اس نظام کا شکار ہو کر ڈگریاں حاصل کرنے کے چکر میں کیریئرازم کا شکار ہوتے تھے یا پھر اس غلیظ سیاست سے بدظن ہو کر سیاست کو ہی گناہ سمجھ بیٹھتے تھے۔ اس تمام تر صورتحال کی جہاں ایک اہم ترین وجہ عمومی سیاست میں نظریات کی پسپائی تھی، وہیں تعلیمی اداروں میں کسی حد تک ایسا ماحول بھی تھا کہ طلبا و طالبات کی بھاری اکثریت اس سارے عمل میں رخنہ انداز ہونے پر مجبور نہیں ہوتی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ حکمرانوں اور ریاستی اداروں کی طرف سے کسی قسم کے حملے نہیں ہوتے تھے، وقتاً فوقتاً فیسوں میں معمولی اضافہ اور اس طرح کے دیگر مسائل کا طلبہ کو سامنا کرنا پڑتا تھا مگر تعلیمی اخراجات کسی حد تک درمیانے طبقے کی نچلی پرتوں کے لیے بھی قابلِ برداشت ہی رہتے تھے۔ محنت کشوں کے بچے تو ویسے ہی پرائمری یا مڈل یا زیادہ سے زیادہ میٹرک تک پڑھ پاتے ہیں اور اس کے بعد ان کو گھر کا خرچہ چلانے کے لیے گاڑی کے ایک پہیے کے طور پر کام میں جوت دیا جاتا ہے۔ کوئی اکا دکا بچے جو سکول میں غیر معمولی نتائج کا مظاہرہ کرتے تھے ان کے لیے حکومتی وظائف وغیرہ دستیاب ہوتے تھے اور وہ کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ معیشت کے غبارے میں مصنوعی ہی سہی لیکن ہوا بھری ہونے کے باعث حکمران سوشل سیکٹر کو اگر

بہت بڑے پیمانے پر وسعت نہیں بھی دے پا رہے تھے مگر وہ پہلے سے موجود تعلیمی سیکٹر پر بہت بڑے حملے بھی نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے یہ اسٹیٹس کو کی کیفیت برقرار تھی۔ اگرچہ اس عرصے میں کالے دھن کا بڑا حصہ سفید ہونے کی غرض سے تعلیمی شعبے کا رخ کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ تعلیم کے میدان میں نجی شعبہ وسعت اختیار کرتا گیا اور اس شعبے میں بہت زیادہ منافع خوری کے امکانات کے باعث دیگر بڑے مگرمچھوں کا رخ بھی اس شعبے کی طرف ہونے لگا۔ اسی عرصے میں 2008ء کے معاشی بحران کے بعد جب پاکستانی معیشت کا غبارہ بھی پھٹا تو ریاست کو بھی IMF کے دباؤ کے نتیجے میں ملک میں دوبارہ نجکاری کے عمل کا آغاز کرنا پڑا۔ جہاں ایک طرف بینک اور دیگر ادارے نجکاری کی زد میں آ رہے تھے وہیں مسلسل بڑھتے ہوئے بحران کے باعث تعلیم اور صحت کا شعبہ بھی اس نجکاری کے اژدہے کے لیے توجہ کا مرکز بننے لگے۔ خاص طور پر گزشتہ دو تین سالوں سے تمام صوبائی حکومتیں، جو اگرچہ مختلف سیاسی پارٹیوں کی نمائندہ ہیں، تعلیمی اداروں کی نجکاری کی پالیسی کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ APS (آرمی پبلک سکول) میں ہونے والے واقعے کے بعد ملک بھر میں طلبہ کے ردِعمل، مشال خان کے قتل کے خلاف طلبہ کے مظاہرے اور سوشل میڈیا پر نکالی جانے والی شدید بھڑاس سے بھی پریشان ہیں۔ ایسی صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے سیاسی جنگل کے کچھ زیادہ 'سیانے کوئے' طلبہ یونین کی بحالی کے حق میں آواز اٹھانا شروع ہو گئے ہیں۔ سینٹ کے چیئرمین رضا ربانی نے اس حوالے سے سینٹ میں بحث کی اور ابھی حال ہی میں سندھ اسمبلی نے طلبہ یونین کے حق میں قرارداد پاس کی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان خواتین و حضرات کو اچانک زیادہ جمہوری دورے پڑنا شروع ہو گئے ہیں بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ طلبہ کی یونین ہونے کی وجہ سے کسی بھی اچانک بڑے سیاسی ردِعمل سے بچا جا سکتا ہے اور یونین کے نمائندوں اور قیادتوں کی ملی بھگت سے اپنے مذموم ایجنڈے کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس قرارداد پر عمل ہوتا ہے تو اس کے بالکل الٹ نتائج برآمد ہونگے۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کے فنڈز مالی بحران کی وجہ سے روک دیئے گئے ہیں اور تمام یونیورسٹیوں کی انتظامیہ کو یہ باور کروایا گیا ہے کہ اپنے اخراجات پورے کرنا آپ کا اپنا سر درد ہے۔ کراچی یونیورسٹی سمیت کئی اداروں میں ملازمین کی تنخواہیں کئی مہینے سے واجب الادا ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ کے پاس اپنی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فیسوں میں اضافے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ بتدریج نجکاری کی ایک ترکیب ہے۔

جس کا طریقہ کار ہائر ایجوکیشن کمیشن کو مکمل طور پر غیر فعال کر کے نجکاری کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ یہ دیکھنا بھی مقصود ہے کہ جب ان اداروں کی انتظامیہ چاروناچار ان اداروں میں فیسیں بڑھانے کی طرف جاتی ہے تو طلبہ کا ردِعمل کس حد تک مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔ ساتھ یونیورسٹیوں کی انتظامیہ کو پورے ادارے کو ایک دم نیلام کرنے کی بجائے، ٹرانسپورٹ، ہاسٹلز، کیفے ٹیریا، لائبریری یا مختلف شعبہ ہائے تدریس کی باری باری الگ الگ نجکاری کرنے پر بھی اکسایا جا رہا ہے۔ کالجوں کی نجکاری کا عمل پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ کچھ اداروں میں مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ لیکن آئندہ سالوں میں یہ عمل بڑے پیمانے پر پھیلے گا۔ عالمی مالیاتی ادارے مزید قرضے دینے کے لیے حکومت کو اپنے مالیاتی اور بجٹ خسارے کو کم کرنے کے لیے دباؤ بڑھائیں گے اور حکومتوں کو اخراجات میں کٹوتیاں کرنی ہونگی۔ ریاست کے بحران اور خطے کی صورتحال کے باعث حکومت کے لیے دفاعی اخراجات میں کٹوتی کرنا آسان نہیں ہوگا اور پھر سوشل سیکٹر ہی قربانی کا بکرا ثابت ہوگا۔ مگر اس بار یہ قربانی ریاست کو بہت بھاری پڑنے والی ہے۔ ریاست کا کوئی بھی حملہ حال ہی میں ابھرنے والی نوزائیدہ طلبہ تحریک کے لیے وہ معروضی تازیانہ ثابت ہو سکتا ہے جو اس میں نئی روح پھونک کر اسے ماضی کی عظیم روایات دہرانے پر مجبور کرے گا۔ حال ہی میں قائدِ اعظم یونیورسٹی کے طلبہ کی شاندار تحریک مستقبل کی اس طلبہ تحریک کی کامیاب ریہرسل ثابت ہوگی۔

قائدِ اعظم یونیورسٹی کے طلبہ نے اس تحریک سے بہت سے اہم اسباق سیکھے ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے یہ اہم سبق حاصل کیا ہے کہ طلبہ تحریک کو زائل کرنے کے لیے حکمرانوں کے پاس سب سے بڑا ہتھیار قومی و لسانی تعصب ہے۔ مذہبی تعصّبات کو شاید اب تعلیمی اداروں میں استعمال کرنا اتنا آسان نہیں رہا تو اسی لیے اب قومی تعصّبات پر حکمران طبقے اور ریاستی اداروں کا انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ طلبہ کو اب صاف صاف نظر آنا شروع ہو گیا ہے کہ طلبہ سیاست پر پابندی ہونے کے باوجود بھی اتنے بڑے تعلیمی اداروں میں انتظامیہ اور حکمران قوم یا زبان کے نام پر گروپ یا کونسلیں بنانے کی اجازت کیوں دیتے رہے ہیں۔ یہ کونسلیں درحقیقت اسٹیٹس کو کی ہی نمائندہ ہیں اور طلبہ تحریک کو مستقبل قریب میں درپیش چیلنجز کا سامنا کرنے سے مکمل طور پر قاصر ہیں اس لیے طلبہ کو آئندہ تحریکوں کی کامیابی کے لیے سنجیدہ اور قومی و لسانی تعصّبات سے پاک نظریاتی پلیٹ فارم درکار ہوگا۔ صرف قائداعظم یونیورسٹی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ ملک بھر کے بڑے تعلیمی اداروں کے طلبہ نے بھی اس تحریک کو بہت غور سے دیکھا ہے اور اس لیے حاصل کیے گئے تجربات اور ان کے اسباق

کا کردار اپنی نامیاتی ساخت میں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس ہڑتال اور تحریک سے یکجہتی کے لیے اسلام آباد اور راولپنڈی کی دیگر یونیورسٹیوں کے طلبہ کے وفد بھی آتے رہے ہیں اور وہاں سے ایک جرأت اور عزم لے کر جاتے رہے ہیں، جس کی بڑی مثال اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی کے طلبہ کا بھی اپنی انتظامیہ سے اضافہ شدہ فیسوں کی واپسی سمیت دیگر مطالبات کو منظور کروالینا ہے۔ اسی یونیورسٹی میں طالبات نے بھی اپنے ساتھ برتے جانے والے امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے سکیورٹی افسران کے دفاتر کا گھیراؤ کیا جو اپنی نوعیت کا غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس کے بعد سے اب تک فیسوں کے معاملے پر بہت سے تعلیمی اداروں میں غم و غصے کی لہر ابھرنا شروع ہو چکی ہے۔ پشاور یونیورسٹی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، انجینئرنگ یونیورسٹی ٹیکسلا میں گزشتہ ہفتوں میں احتجاجی مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ کالجوں میں بھی طلبہ کو شکتی ملے گی اور وہ اس عزم اور حوصلے کو بروئے کار لاتے ہوئے میدانِ عمل میں اتریں گے۔ ریاستی ادارے بھی اس طلبہ تحریک سے نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنے کی طرف جائیں گے۔ کچھ افراد طلبہ کو چھوٹ دینے کے حق میں ہوں گے اور کچھ جبر کرنے کی وکالت کریں گے۔ رعایتوں کے حامی یہ دلیل دیں گے کہ اس طریقے سے طلبہ کا اعتماد جیت کر بعد میں بڑا حملہ کیا جائے۔ لیکن ہر ملنے والی چھوٹ طلبہ کو دفاعی لڑائی سے نکل کر سیاسی مطالبات کے گرد منظم کرنے کی طرف جائے گی۔ اسی طرح ریاست کی طرف سے کیا جانے والا ہر حملہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو تحریک کی حمایت میں متحرک کرے گا۔ اسی عمل کے دوران اس طلبہ تحریک کا کردار تبدیل ہوگا اور یہ تحریک ایک دفاعی ردِعمل سے بڑھ کر جارحانہ سیاسی مطالبات کا روپ دھارے گی جس کے لیے وہ اپنے سیاسی اوزار یعنی نئی لڑاکا طلبہ تنظیمیں بھی تراش لائے گی۔ مارکس وادیوں کی طرف سے کی جانے والی مداخلت اس عمل کو سہل انگیز اور نتیجہ خیز بنا کر سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کی عمومی جدوجہد کے لیے کارآمد بنا سکتی ہے۔

مزدور تحریک، امکانات اور 'حقیقت پسندی'

پاکستان کی ٹریڈ یونین اشرافیہ دنیا کی غلیظ ترین ٹریڈ یونین اشرافیہ میں سے ایک ہے۔ جہاں مزدور تحریک گزشتہ تین دہائیوں میں شدید بحران کا شکار رہی ہے، وہیں اسی عرصے میں ابھرنے والی اشرافیہ نے مال کمانے اور مالکان اور انتظامیہ کی دلالی کرتے ہوئے محنت کشوں پر ظلم و ستم

کرنے کی انتہا کر دی ہے۔ خدمات کے شعبے میں دیکھا جائے تو واپڈا میں بہت بڑی یونین موجود ہے مگر آئے روز محنت کشوں کے کرنٹ لگنے یا دیگر مختلف حادثات کی وجہ سے شہید ہو جانے کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ سکیورٹی آلات کی عدم دستیابی سمیت تنخواہوں میں افراطِ زر کی نسبت سے اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن یہ مزدور اشرافیہ جہاں ایک طرف مقامی حکمران طبقے کی گماشتہ ہے وہیں عالمی سامراجی اداروں سے بھی ILO جیسے اداروں کی وساطت سے جڑی ہوئی ہے۔ گزشتہ عرصے میں حقیقی مسائل سے ہٹ کر آنے دو آنے کی لڑائی اور فروعی مراعات کے لیے یہ محنت کشوں کو متحرک کرتے رہے ہیں جبکہ نجکاری سمیت بہت سے اہم مسائل پر تحریک سے کنارہ کشی کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن نیچے سے محنت کشوں کے دباؤ کے باعث نجکاری کے خلاف گزشتہ کچھ برسوں میں کئی بڑے بڑے احتجاجی مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں۔ عام محنت کشوں کے آگے جوابدہ ہونے کی بجائے اس ٹریڈ یونین اشرافیہ کا عام محنت کشوں کی طرف رویہ انتہائی سفاکانہ اور ہتک آمیز ہوتا ہے۔ حقیقی مطالبات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہر چھوٹی موٹی مراعت، بونس یا الاؤنس وغیرہ محنت کشوں کو دلوا کر یہ ایسے جتاتے رہتے ہیں جیسے انہوں نے محنت کشوں پر کوئی احسان کیا ہو، جبکہ ان کی اپنی عیاشیاں ایسی ہیں کہ جن پر بیوروکریٹوں کو بھی رشک آتا ہے۔ ہر 'احسان' کے بعد ان کی فرعونیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آئندہ عرصے میں ہونے والی ممکنہ نجکاری کے لیے یہ پہلے ہی اپنے آپ کو فروخت کر چکے ہیں لیکن اس دفعہ محنت کش ان کا فیصلہ کن احتساب کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ واپڈا کے محنت کشوں میں اس بکاؤ قیادت کے خلاف شدید نفرت اور غصہ پایا جاتا ہے مگر کوئی متبادل نہ ہونے کے باعث وہ آج تک ان کو برداشت کرتے آ رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ باقی اداروں میں بھی کوئی بہت بڑی تحریکیں نہیں رہی ہیں۔ PIA، PTCL اور KESC وغیرہ میں تحریکیں ابھری ہیں لیکن وہ بھی ایک دوسرے سے جڑنے کی بجائے الگ الگ لڑ کر زائل ہو گئیں۔ اصل میں کوئی ایسی فیڈریشن موجود نہیں تھی جو ان تحریکوں کو آپس میں جوڑ کر ایک ملک گیر تحریک کی شکل دے سکتی۔ جو اکا دکا فیڈریشنیں موجود بھی تھیں وہ پھر انہی غدار قیادتوں کے کنٹرول میں ہونے کے باعث ہمیشہ اس موقع پر غائب ہو جاتی رہی ہیں جہاں ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔

لیکن اب صورتحال کافی حد تک تبدیل ہو رہی ہے۔ معاشی بحران کے باعث حکومت ایک وقت میں تمام اداروں کے مزدوروں پر بڑے معاشی حملے کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اور ایسے وقت

میں جب دنیا بھر کے محنت کشوں اور بالخصوص ہمارے پڑوس میں انڈیا کے محنت کشوں کی ایک لڑاکا مزدور تحریک موجود ہے اور گزشتہ تین سال سے مسلسل عام ہڑتالیں کی جا رہی ہیں اور اس وقت جب ہم یہ لائنیں لکھ رہے ہیں ایک غیر معینہ مدت کی عام ہڑتال کی تیاری کی جا رہی ہے اور مودی حکومت جھوٹے وعدوں پر محنت کشوں کو ٹرخانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایسی صورتحال میں پاکستان کے محنت کش بھی اس تحریک کے اثرات سے لڑائی لڑنے کی شکتی ضرور کشید کریں گے۔ مگر گزشتہ طویل عرصے میں عام ہڑتال تو درکنار محض ہڑتال کا تصور بھی پاکستان کی ٹریڈ یونین اشرافیہ نے یہاں کی مزدور تحریک کے لیے بیگانہ بنا دیا ہے۔ کبھی کہیں اگر کسی 'سر پھرے' نے ہڑتال کی بات کر بھی دی تو اسے شر پسند عنصر سمجھا جاتا تھا۔ نجی انڈسٹریل سیکٹر کے 97 فیصد کے لیے یونین ہی ایک بیگانہ سی اصطلاح بنا دی گئی تھی۔ یا قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے بڑے اداروں میں پاکٹ یونینیں مزدور اشرافیہ اور مالکان کی ملی بھگت سے کام کرتی تھیں۔ نجی شعبے میں جتنی بھی ٹریڈ یونین فیڈریشنیں کام کر رہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر عملاً این جی اوز کی شکل اختیار کر چکی ہیں اور انہوں نے محنت کشوں کے شعور کو مسخ کرنے اور ہر ابھرتی قیادت کو کرپٹ کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور آج بھی وہ یہی کام کرنے میں مصروف ہیں۔ ان این جی اوز کے مالکان کے بائیں بازو کے لیڈران کے ساتھ ساتھ مالکان، انتظامیہ اور لیبر ڈیپارٹمنٹ، NIRC اور دیگر حکومتی اداروں کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ ہے جس کے باعث یہ مزدور لیڈروں کو بہلا پھسلا کر اپنے چنگل میں پھنسا لیتے ہیں اور بعد میں ان سے چندے وغیرہ بٹورتے رہتے ہیں یا اپنے مغربی آقاؤں سے بھیک وصول کرتے رہتے ہیں۔ اس منافع بخش کاروبار میں بہت سوں نے بہت زیادہ مال بٹورا ہے۔ اس کاروبار کا نام 'حقیقت پسندی' رکھا گیا ہے۔ اس لیے ہڑتال یا لڑائی کے بجائے مفاہمت یا لین دین کو ہی اس کاروبار میں جائز، درست اور وقت کی ضرورت قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ وقت ان کاروباریوں کے خیال میں کبھی تبدیل نہیں ہوگا بلکہ تبدیلی کا نام سنتے ہی حکمران طبقے سے زیادہ تو ان کے یہ دلال پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور بدقسمتی سے زیادہ تر صنعتی علاقوں میں ان کے تنخواہ دار ایجنٹس موجود ہیں، اس لیے یہ ہر پوٹینشل مزدور نوجوان کو، جو سیاست میں دلچسپی رکھتا ہو یرغمال بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں بظاہر کسی بھی عام ہڑتال یا ملکی سطح کی تحریک کا ابھرنا ناممکن سا دکھائی دیتا ہے۔

لیکن سطح کے نیچے صورتحال بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ آئندہ نجکاری کی شدید لہر میں

نجکاری کی لسٹ میں شامل تمام اداروں سے محنت کشوں کی مزاحمت ابھرنے کے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔ خدمات کے شعبے کی یہ تحریکیں پرائیویٹ سیکٹر کے محنت کشوں کو بھی متاثر کریں گی۔ اور اگر اس صورتحال میں طلبہ تحریک بھی ابھر کر سامنے آتی ہے تو وہ مزدور تحریک کے حوصلے بلند کرنے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے اگر ریاست جبر کا سہارا لیتی ہے تو یہ تحریک کو مشتعل کرنے کے ساتھ ساتھ بدعنوان قیادتوں کے فیصلہ کن امتحان کی گھڑی بھی ہوگی۔ رائج الوقت قیادتوں کے سمجھوتے یا فرار کی صورت میں یہ نوآموز مزدور تحریک نئی لڑاکا قیادتوں کی تشکیل و ترویج کی طرف بڑھے گی۔ جبر کے لیے فوجی عدالتوں سے لے کر قومی، لسانی، مذہبی ناموں سے پالے گئے غنڈے بھی ان تحریکوں پر حملہ آور کروائے جائیں گے۔ جیسا کہ ہم ماضی میں بھی کراچی میں دیکھ چکے ہیں کہ بلدیہ کے پاور لومز کے ہڑتالی مزدوروں کو زدوکوب کرنے کے لیے ان کے گھروں میں کراچی کی طاقتور تنظیموں کے غنڈے بھیجے جاتے تھے جو انہیں ڈرا دھمکا کر واپس کام کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ ان نیم فاشسٹ قوتوں کو پالا ہی اس لیے جاتا ہے کہ جب ریاست براہِ راست جبر کی پوزیشن میں نہ ہو تو ان کو استعمال میں لایا جائے۔ کسی ایک ادارے کی تحریک تک تو یہ ایک کارآمد نسخہ ہو سکتا ہے مگر ایک بڑی مزدور تحریک کے لیے یہ رکاوٹیں غیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ ابھی اس وقت ملک میں پیرامیڈکس، اساتذہ، سٹیل مل، کسان، PWD، پاور لومز اور نجی شعبے میں کچھ چھوٹی چھوٹی تحریکیں نظر آ رہی ہیں مگر ماضی قریب میں نرسوں، ینگ ڈاکٹرز، ہیلتھ ورکرز، سرکاری ملازمین سمیت دیگر بہت سے اداروں میں ہلچل موجود رہی ہے۔ مستقبل میں واپڈا، ریلوے، پاکستان پوسٹ سمیت باقی ادارے بھی اس میں شامل ہو کر اس مزدور تحریک کے کردار کو تبدیل کر دیں گے۔ اگر اس وقت ہم انڈیا کی مزدور تحریک اور پاکستان کی مزدور تحریک کا موازنہ کریں تو اس میں صرف ایک واضح اور فیصلہ کن فرق نظر آتا ہے اور وہ وہاں پر 'آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس' اور اس جیسے دیگر ملکی سطح کی فعال فیڈریشنوں کا موجود ہونا ہے۔ گزشتہ سال PIA کی ہڑتال کے دنوں میں سارے اداروں کے محنت کش اس تحریک کو متجسس اور امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس سال جولائی میں ریلوے کے ڈرائیوروں کی ہڑتال اور اس پر ہونے والے ریاستی جبر کے خلاف بھی دیگر اداروں کے محنت کشوں کو منظم کیا جا سکتا تھا۔ اگر یہاں پر بھی اس وقت کوئی ملک گیر سطح کی منظم اور فعال لڑاکا ٹریڈ یونین فیڈریشن موجود ہوتی تو یہاں پر بھی عام ہڑتال کی جا سکتی تھی۔ تمام معروضی عناصر موجود تھے اور آج بھی وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

ممکنہ نجکاری کے خلاف ایک شاندار عام ہڑتال کسی دیوانے کا خواب نہیں بلکہ عین ممکنہ اور وقت کی ضرورت بن چکی ہے۔ صرف اسے کال کرنے والی ایسی قوت کی کمی ہے جس کی آواز بروقت محنت کشوں کی تمام ہراول پرتوں تک رسائی اور تاثیر رکھتی ہو۔ حالات وواقعات کے تھپیڑوں میں ایسی قوت کا ابھرنا بھی ناگزیر ہے۔

عمومی شعور کی ہیئت اور کیفیت

بہت سے درمیانے طبقے کے دانشور ہر وقت لوگوں کے پسماندہ شعور اور عوام کی جہالت کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب بھی ان سے کسی تحریک یا تبدیلی کی بات کی جائے تو وہ اس کے امکانات سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔ بہت سے تو ایسے ہیں جو اس حد تک ہٹ دھرم ہیں کہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں 'ساری دنیا میں تبدیلی آسکتی ہے لیکن پاکستان میں نہیں آسکتی'۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ خواتین وحضرات جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہوتے ہیں کہ 'مزاروں پر چادریں چڑھانے اور قبروں کو چومنے چاٹنے والی قوم، عاملوں اور پیشہ ور فقیروں پر پیسے لٹانے والی قوم، جعلی پیروں اور مولویوں کے ہاتھ پاؤں چومنے والی قوم، سیاسی لیڈروں کو مذہبی پیشواؤں یا حتیٰ کا خداؤں کا درجہ دینے والی قوم، عورتوں پر ونی اور کاروکاری جیسے مظالم ڈھانے والی قوم وغیرہ وغیرہ یعنی اس طرح کے غیر عقلی اور قابلِ نفرت افعال سرانجام دینے والی قوم کسی بھی ترقی پسندانہ اقدام یا تحریک کو کیسے آگے بڑھا سکتی ہے؟ کچھ لوگ ابھی حال ہی میں مشال خان کے قتل میں ملاؤں کی بجائے یونیورسٹی جیسے اعلیٰ ادارے کے طلبہ کے ملوث ہونے کو بھی دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں کہ جس ملک میں یونیورسٹیوں میں بھی اتنی جہالت ہو وہاں تبدیلی کیسے آسکتی ہے یا کوئی تحریک کیسے چل سکتی ہے؟ بظاہر یہ تمام دلائل بہت مضبوط اور قوی محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر ان کو سائنسی استدلال کے میزان پر تولا جائے تو یہ فوراً اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔ اصل میں ان تمام دلائل میں جو قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان میں شعور کو ایک جامد وساکت شے تصور کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر شعور کی اس وقت یعنی موجودہ لمحے میں یہ کیفیت ہے تو آئندہ بھی رہے گی۔ یا اگر ان کو ماضی کی تحریکوں کا حوالہ بھی دیا جائے تو زیادہ تر تو ماننے سے ہی انکاری ہو جاتے ہیں اور کچھ منطقی ثبوتیت کو استعمال میں لاتے ہوئے یہ جوابی دلیل دیتے ہیں کہ ان تحریکوں کے نتائج بھی تو ناکامی کی صورت میں ہی نکلے کیونکہ یہ لوگ ہی نااہل اور جاہل تھے۔ اس کے ساتھ

ساتھ دوسری بڑی اور انتہائی اہم غلطی جو ان دلائل میں کی جاتی ہے وہ شعور کی کیفیت (content) اور اس کی ہیئت (form) میں ازلی اور ابدی یکسانیت کو فرض کر لینے کی ہے۔ اسی طرح شعور کے بدلنے پر اگر یہ درمیانے طبقے کے خواتین وحضرات قائل ہو بھی جائیں تو یہ تنگ آ کر یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ 'ہنوز دلی دور است' یعنی ابھی مستقبل قریب میں تو ایسا کچھ ہونے والا نہیں لہٰذا اگر ہماری زندگیوں میں ہی کوئی تبدیلی نہیں آنے والی تو اس کے لیے سر کھپانے کا ہمیں کیا فائدہ۔ اس دلیل میں شعور کی تبدیلی کے عمل میں مرحلہ واریت کو فرض کر لیا گیا ہے۔

حقیقت میں شعور کوئی جامد یا ساکت شے نہیں۔ اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ گزشتہ دو تین دہائیوں میں شعور میں بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ عوام الناس اسی سماج کا حصہ ہیں جس میں مذکورہ بالا طلبہ اور مزدور تحریکیں جاری و ساری ہیں اور وہ تحریکیں بھی عام انسانوں کے شعور پر اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ اگر ہم گھریلو خواتین کی مثال لے لیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے شعور میں بھی اشیائے خورد و نوش اور دیگر اشیائے صرف کی قیمتوں کے بڑھنے، ٹی وی پر دھماکے کی خبر یا علاقے میں کسی جلسے جلوس کے اثرات پڑتے ہیں جو ان کے سماجی تجربے میں مقداری اضافے کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک وقت میں بہت عقیدہ پرست یا پیر پرست آدمی جب وہ ان تمام حقیر عادات و افعال کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی یہ عین ممکن ہے کہ یہ اس کے یا اس کے طبقے کے عمومی شعور کی حقیقی کیفیت کے برخلاف عمل ہو لیکن سماجی معمول، عادت یا روایت کے طور پر وہ ابھی اس طرح کے افعال کو جاری رکھنے پر مجبور ہو۔ یا یوں کہہ لیں کہ ابھی اس کے شعور میں وہ فیصلہ کن معیاری جست نہیں لگی ہوتی جو اس کو جھنجوڑ کر ان قبیح اور حقیر افعال سے کاٹ کر رکھ دے۔ اس وقت پاکستان کی آبادی کی اکثریت بھی اسی طرح روایتاً یہ تمام رجعتی سماجی معمولات کو جاری رکھے ہوئے ہے اور سطح کے نیچے اور شعور کی بنیادوں میں بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں یا عوام کی ان پرتوں کے کسی فرد سے جن کا شعور اس تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے، کوئی شخص سوال کرے کہ کسی خاص ٹھوس (concrete) مسئلے پر اس کی کیا رائے ہے تو اسے شعور کی اس تبدیلی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مشال خان کے قتل پر عام لوگوں کی رائے بہت ترقی پسندانہ اور انقلابی تھی۔ اسی طرح سبزیوں کی قلت یا قیمتوں میں اضافے وغیرہ یا کسی خاص لیڈر کی تقریر یا اخباری بیان کے بارے میں سوال کیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب لوگ مختلف انداز سے سوچنا شروع ہو گئے ہیں۔ ماضی میں ان سوالات کے

جوابات انتہائی مایوس کن ہوا کرتے تھے جیسے سب خدا کی مرضی ہے، اللہ جو کرتا ہے بہتری کے لیے کرتا ہے، ہمارے اپنے ہی اعمال خراب ہیں، جیسے عوام ویسے حکمران وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب لوگ حکمران طبقے اور ان کی عیاشیوں پر سیدھے سیدھے سوالات اٹھاتے ہیں اور ان سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر جب انہی افراد سے مجرد اور عمومی (general) سوالات کیے جائیں جیسا کہ تبدیلی کیسے آئے گی، مذہب کا کیا کردار ہے، رجعتی کالے قوانین ختم ہونے چاہئیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ تو ان کے جوابات ظاہر ہے وہی پرانے اور دقیانوسی ہی ہوتے ہیں۔ حقیقت میں ان سوالات میں یہ محنت کش یا عام لوگ یہ بنیادی نکتہ دیکھ ہی نہیں پا رہے ہوتے کہ ان سوالات کا ان کی روزمرہ زندگی سے کیا تعلق ہے لیکن صرف اس وقت تک کہ جب زندگی کی مشکلات اور تکلیفات میں شدت انہیں یہ تعلق تلاش کرنے پر مجبور کر دے۔ یہ جوابات دراصل ان کے شعور کی حقیقی کیفیت کا درست اظہار نہیں ہیں بلکہ یہاں شعور کی کیفیت اور ہیئت میں سوالات اور مسائل کی عمومیت اور مجرد صورتحال کے باعث ابہام اور تضاد پیدا ہو جاتا ہے جسے دوٹوک اور واشگاف تاریخی واقعات ہی ختم کر سکتے ہیں۔

جس دن سماج انقلابی تحریک میں داخل ہو جاتا ہے اس دن شعور کی تبدیلی کا عمل شروع نہیں ہوتا بلکہ وہ پہلے سے جاری ہوتا ہے اور انقلابی تحریک کی شکل میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر پھر وہ انقلابی تحریک مہینوں یا دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں عوام کو فیصلہ کن انداز میں تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ شعور کی باطنی کیفیات کے بے شمار مظاہر ہوتے ہیں۔ کسی بھی فرد یا کمیونٹی کے کسی ایک خاص فعل کو دیکھتے ہوئے اس کے عمومی شعور کا تجزیہ یا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں بھی عوامی شعور کا جوہر یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کا اظہار مکمل طور پر مذہبی سوچ کے خاتمے، عورتوں کے پردہ کرنے کی روایت کے اختتام یا عاملوں اور جعلی پیروں سے مکمل نجات کی شکل میں ہی ہو بلکہ فی الوقت اس کا سب سے بڑا مظہر عوام کا اپنی سابقہ سیاسی روایات اور قیادتوں سے مکمل طور پر انحراف ہے۔ زیادہ تر لوگ اس کیفیت کے لیے سیاسی بیگانگی کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں، لیکن یہ اصطلاح غیر موزوں اور ناکافی ہے۔ یہ حقیقت کے صرف ایک رخ کی عکاسی کرتی ہے۔ اصل میں یہ ماضی کی سیاسی قیادتیں کسی دھات پر لگے زنگ کی طرح عوامی شعور کو آلودہ کرتی ہیں۔ گزشتہ عرصے کے تجربات نے شعور سے ان کو کھرچ کر شعور کی نئے تاریخی معرکوں کے لیے تیاری اور 'نئے' متبادلوں اور قیادتوں کو آزمانے کی اہلیت میں اضافہ کر دیا ہے اور

اب چھوٹی چھوٹی تحریکوں کے ذریعے یہ عوامی شعور ان قیادتوں کو پرکھنے اور پھر ان میں سے درست اور وقت سے ہم آہنگ قیادت کو ڈھونڈ نکالنے کی مشق میں مصروف ہے۔ یہ طلبہ کی اور مزدوروں کی حالیہ تحریکیں جو پچھلے کچھ عرصے سے عوامی شعور میں اہم مقداری تبدیلیوں کا باعث بن رہی ہیں، ایک معیاری چھلانگ کے ذریعے اپنا اظہار ضرور کریں گی۔ ضروری نہیں ہے کہ ان میں سے ہر تحریک کامیاب ہو، بسا اوقات پسپائی سے شعور زیادہ اہم نتائج اخذ کرے گا اور ہم آئندہ چند برسوں میں کسی بھی وقت عوام الناس کی ایک ملک گیر انقلابی تحریک ابھرتے ہوئے دیکھیں گے۔

بایاں بازو یا 'خلائی مخلوق'

سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا بھر کے بائیں بازو کی طرح پاکستان کے بائیں بازو کا بھی شدید زوال نظر آیا۔ زیادہ تر بائیں بازو کے نامور دانشور این جی اوز کی دلدل میں غرق ہو گئے۔ باقی ماندہ پیپلز پارٹی اور چند ایک تون لیگ جیسی دائیں بازو کی پارٹیوں کی غلاظت میں بھی جا پھنسے۔ اب تبدیل شدہ کیفیت میں کوئی مداخلت کرنے کی بجائے یہ اس کو سمجھنے سے ہی مکمل طور پر قاصر ہیں۔ اس وقت بائیں بازو کی سب سے 'بڑی' سمجھی جانے والی پارٹی AWP کے نظریہ دانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اس عہد کو کھلم کھلا 'انسانی تاریخ کا سب سے رجعتی عہد' قرار دے رہے ہیں۔ یہ پارٹی درحقیقت کوئی پارٹی ہے ہی نہیں بلکہ این جی اوز اور کچھ سابقہ بائیں بازو کے تھکے ہارے دانشوروں کا ملغوبہ ہے جسے یہ دانشور اور سیاسی کارکنان دماغی ورزش کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ محنت کشوں کے کسی بھی حقیقی ایشو پر کوئی جدوجہد کرنے کی بجائے یہ اپنے مجرد نعروں اور پروگراموں کی ترویج و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ ایسے وقت میں جب طلبہ اور مزدور متحرک ہو رہے ہیں یہ 'رجعتی مذہبی قوانین کے خاتمے' یا زرعی اصلاحات کے لیے جدوجہد کو اپنی سب سے اہم ترجیح بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ان نعروں کے ذریعے یہ انتخابی سیاست میں کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہوئے عوامی سیاسی دھارے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ان سے تھوڑی سی بھی بحث کی جائے اور ان کو مزدور تحریک میں شمولیت پر اکسانے کی کوشش کی جائے تو ایسا لگے گا جیسے یہ مزدور طبقے کے وجود کے ہی منکر ہوں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جمہوری مطالبات کے لیے جدوجہد بہت اہم ہے لیکن صرف جمہوری مطالبات کے گرد کوئی بڑی تحریک بنانا محض کوئی خام خیالی ہی ہو سکتی ہے۔ اس وقت مہنگائی، بیروزگاری، مہنگی تعلیم، علاج، لوڈ شیڈنگ

اور اجرتوں میں اضافے سمیت دیگر اہم مسائل کے لیے بڑے معرکوں کا آغاز ہو رہا ہے۔ ایسے میں زرعی اصلاحات کا مطالبہ ایسے ہی ہے جیسے کسی میت پر کھڑا ہو کر کوئی ڈھول پیٹنا شروع کر دے۔ یہ عبوری مطالبات اور محنت کشوں کے عمومی مسائل کو نظام سے جوڑنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہو چکے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا نظریاتی طور پر اپاہج ہو جانا ہے کیونکہ یہ پارٹیاں جو ماضی میں پہلے مرحلے میں جاگیرداری کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب اور دوسرے مرحلے میں سوشلزم کی بات کرتی تھیں اب مرحلہ واریت کی تھیوری سے بھی دستبردار ہو چکی ہیں اور اب صرف 'جمہوریت' کے لیے ہی جدوجہد کر رہی ہیں چاہے اس کے لیے جماعتِ اسلامی سے ہی کیوں نہ انتخابی اتحاد کرنا پڑ جائے۔

اسی طرح کچھ بائیں بازو کے گروپ محض قومی آزادی کی تحریکوں کو ہی حتمی مقصد قرار دے چکے ہیں۔ ان کے خیال میں بس یہ ریاست ختم ہو جائے اور مظلوم قومیں آزاد ہو جائیں تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ یہ آزادی کب اور کیسے مل سکتی ہے، اس کی یہ لوگ وضاحت کرنے سے مکمل طور پر قاصر ہیں۔ جو قومی آزادی کی تحریکیں پسپائی کی طرف گئی ہیں ان کی پسپائی کی وجوہات کو تلاش کرنے کی بجائے یہ ان کی غیر مشروط حمایت کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ تمام لوگ نیشنلزم اور مارکسزم کے مابین بنیادی فرق ہی فراموش کر چکے ہیں۔ AWP کی مقامی قیادتیں بھی یہی راگ الاپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے مظلوم قومیتوں کے دفاع کے لیے اور ریاستی جبر کے خلاف جدوجہد کرنا بھی ہر کمیونسٹ کا فرض ہوتا ہے مگر اس جدوجہد کی کامیابی کی ضمانت بھی اسی بنیادی شرط سے منسلک ہے کہ اس جدوجہد میں محنت کش عوام کی بھاری اکثریت کو کیسے شامل کیا جائے۔ مگر یہ خواتین و حضرات کبھی بھی مزدوروں کی کسی تحریک میں شامل نہیں ہوتے اور یوں یہ کسی بھی حوالے سے اس قومی آزادی کی تحریک کی بھی کوئی خدمت نہیں کر رہے جس کے یہ علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ اصل میں کمیونسٹوں کا کسی قومی آزادی کی تحریک میں شامل ہو کر اس میں انقلابی کردار یہی ہو سکتا ہے کہ یہ اس تحریک کی حمایت میں محنت کشوں کو اور محنت کشوں کی تحریکوں کی حمایت میں ان قومی تحریکوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ایک ناقابلِ تسخیر قوت تعمیر کی جا سکے۔ اس کے بالکل الٹ قومی آزادی کی تحریکوں کو انہی کے محدود خول میں قید کر کے ان کو محبوس کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے اب ان کا دن گھٹ رہا ہے اور وہ قریب المرگ دکھائی دے رہی ہیں۔ مزدور تحریک کا نیا ریلا ہی ان تحریکوں میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ یہ ہر حوالے سے ایک قابلِ رحم کیفیت ہے جو

درمیانے طبقے کی رومانویت اور مہم جویانہ ذہنیت کا بیہودہ امتزاج ہے۔ پیپلز پارٹی میں کام کرنے والے انقلابی بھی اب اس حد تک مفاد پرستی کی دلدل میں غرق ہو چکے ہیں کہ پیپلز پارٹی کی بدعنوان قیادت کے دفاع میں ہر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ انہوں نے بھی عملاً محنت کش طبقے کے وجود سے انکار ہی کر دیا ہے اور اب یہ بڑے بڑے بیوروکریٹوں، کالم نگاروں، فنکاروں، سیاستدانوں اور این جی اوز کے ساتھ تعلقات قائم کر کے ایک بڑی قوت بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی 'سول سوسائٹی' پر مکمل طور پر انحصار کر بیٹھے ہیں جس پر کچھ برس پہلے تک جملے کسا کرتے تھے۔ یوں انہوں نے اپنے اور محنت کش طبقے کے بیچ ایک بہت وسیع خلیج حائل کر لی ہے۔ ایک پیلا آسمان ہے جس سے محنت کش طبقہ شدید نفرت کرتا ہے۔ ایسے میں ان نام نہاد انقلابیوں کی جو ذہنی کیفیت ہے، جب اس کا زمینی حقائق سے موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ سارا بایاں بازو کسی اور سیارے کی مخلوق معلوم ہوتا ہے۔

اختتامیہ

اگر پاکستان کی معیشت، سیاست، ریاست، سماجی کیفیت اور عمومی شعور کی حرکت سمیت تمام معروضی و موضوعی عوامل کا ایک کُل کے طور پر ان کے باہمی تعلق کے اندر سائنسی تجزیہ کیا جائے تو مارکس وادیوں کے لیے یہ ایک بہت بڑے چیلنج کی سی صورتحال ہے۔ یہ بلاشبہ کوئی انقلابی کیفیت نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت عوام کسی بہت بڑی تحریک میں سرگرم ہیں۔ وہ جب ہوں گے تو اس پر بحث کر کے اسے ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو گی۔ لیکن یہ ایک ردِ انقلابی یا رجعتی صورتحال بھی ہرگز نہیں۔ سوویت انہدام کے بعد جنم لینے والی رجعتی اور ردِ انقلابی صورتحال کے خاتمے پر تو 2007ء میں بے نظیر کی وطن واپسی کے گرد ابھرنے والی تحریک نے ہی مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی اور اس کے بعد عالمی معاشی بحران کے اثرات کے تحت گزرتے وقت کے ساتھ عوامی تحرک میں اضافہ ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ ابھی یہ ایک بڑی انقلابی تحریک سے پہلے کے عبوری دور کا اہم مرحلہ ہے جس میں سے سماج گزر رہا ہے۔ ہم اس مرحلے کی معیاد اور عمر کا بالکل درست اندازہ نہیں لگا سکتے مگر حتمی طور پر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرحلہ کیا ہے اور اس سے آگے سفر کس سمت میں ہو گا اور کس سمت میں ہرگز نہیں ہو گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ 2008ء سے پہلے کا پاکستان اور اس کی ابدی نظر آنے والی سماجی و سیاسی 'سچائیاں' اب کبھی واپس آنے والی نہیں ہیں۔

مروجہ سیاسی پارٹیاں اور سماجی ڈھانچے اپنی طبعی عمر پوری کر چکے ہیں۔ ان کی جگہ لینے والی سیاسی قیادتیں ابھی تک تیار نہ ہونے کے باعث یہ ابھی تک مسلط اور افق پر براجمان ہیں۔ اور یہ اس وقت تک رہیں گی جب تک ان کو وقت اور معروض سے ہم آہنگ قیادتیں ہٹا کر ان کی جگہ نہیں لے لیتیں۔ ایسے میں باقی ماندہ بایاں بازو معروض میں ایسی 'غیر متوقع' فیصلہ کن تبدیلیوں کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہے۔ مارکس وادیوں کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج بن چکا ہے کہ چھوٹی قوتوں اور نہ ہونے کے برابر وسائل کے باوجود بھی انہیں اس اہم تاریخی مرحلے میں وسیع ترین سیاسی خلا کو پر کرنے کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ نظریات پر غیر متزلزل رہتے ہوئے جرات، ثابت قدمی، مستقل مزاجی، معاملہ فہمی اور طریقہ کار کی لچک یہ سب عناصر مل کر اس صورتحال میں مداخلت اور کامیابی کی راہ ہموار کریں گے۔